کلامِ حکیم

مجموعۂ کلام جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب مرحوم

مرتّبہ

ڈاکٹر افتخار احمد صدّیقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ — لاہور

اگرچہ خلیفہ عبدالحکیم باضابطہ طور پر شاعر نہیں تھے اور انھوں نے اپنے آپ کو شعرا کے زمرے میں شامل نہیں کیا، لیکن شعر گوئی کا ذوق انھیں فطری طور پر ودیعت ہوا تھا۔ ان کی شاعری کی اٹھان بڑی امید افزا تھی۔ ابتدائی دور کی ایک طویل نظم بہ عنوان "غالب" رسالہ "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں غالب کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے غالب کا اسلوب اختیار کیا گیا۔ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا تاجور نجیب آبادی نے نومبر ۱۹۱۸ کے "مخزن" میں لکھا:

"خلیفہ صاحب پنجاب کے ان قابل قدر ہونہار نوجوانوں میں ہیں جن پر علمی دنیا ناز کرے گی۔ خلیفہ صاحب کو شاعری کی دنیا میں بھی وہی مرتبہ حاصل ہے جو جہان فلاسفی میں۔ ڈاکٹر اقبال کے بعد پنجاب بھر میں آپ سے کوئی بہتر شاعر نہیں۔" مولانا تاجور کو یہ توقع خلیفہ صاحب کا ابتدائی کلام دیکھ کر پیدا ہوئی ہوگی کہ یہ نوجوان شاعر آئندہ اقبال کی جانشینی کا شرف حاصل کرے گا۔

اس مجموعے میں خلیفہ صاحب کے زمانۂ طالب علمی سے لے کر آخری دور تک کا کلام شامل ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ زمانۂ قیام حیدر آباد (۱۹۱۸-۱۹۴۳) کی بے تکلف ادبی صحبتوں کی یادگار ہے۔ اس مختصر مجموعے میں ان کے دردمند دل اور ان کے متوازن و متحرک ذہن کے جتنے گوشے بے نقاب ہوئے ہیں اتنے ان کی وقیع و ضخیم تصانیف میں بھی نہیں ہو سکے۔

کلامِ حکیم

مجموعۂ کلام جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب مرحوم

مرتّبہ

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ، لاہور

بار اول .. .. .. جون ۱۹۷۳

محمد اشرف ڈار (افسر انتظامی) نے ... کیمبرج پریس سے
چھپوا کر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے شائع کیا

پیش لفظ

اب سے کوئی نو دس برس اُدھر کی بات ہے، ایم-اے اردو کی ایک طالبہ عزیزہ فریدہ خانم میری نگرانی میں خواجہ دل محمد دلؔ کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مقالہ لکھ رہی تھیں۔ خواجہ صاحب کی قومی نظموں، رُباعیوں اور دوہوں وغیرہ کے بعد جب ان کے منظوم ترجموں میں "دل کی گیتا" کی باری آئی تو تقابلی مطالعے کی غرض سے اردو نثر و نظم میں گیتا کے مختلف تراجم فراہم کیے گئے۔ منظوم ترجموں میں اثر لکھنوی منور لکھنوی، مولانا حبیب احمد (مالک و مدیر اخبار سیاست، لاہور)، پنڈت سحر دہلوی کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم کا ترجمہ بھی شامل تھا۔ خلیفہ صاحب کی متعدد تحریروں اور تقریروں کے ذریعے میں اُن کے بلند مذاق سخن سے آشنا ہو چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں لیکن اس سے پہلے ان کے کلام کے بہت کم نمونے نظر سے گزرے تھے۔ شوق و تجسّس کی نگاہ سے اس منظوم ترجمے کے جستہ جستہ حصے دیکھے تو گمان گزرا کہ اس سے بہتر رواں، فصیح اور معنی خیز ترجمہ ممکن نہیں۔ لیکن جب گیتا کے ایک مستند نثری ترجمے (از مولوی محمد اجمل خاں صاحب) کو سامنے رکھ کر متن کی عبارات سے منظوم تراجم کا موازنہ کیا گیا تو یہ ماننا پڑا کہ خواجہ دل محمد صاحب کا ترجمہ، فصاحت اور روانی کے باوصف متن سے زیادہ قریب ہے اور خلیفہ صاحب کا ترجمہ بوجہ افراط و تفریط، اس سے فروتر ہے۔

خلیفہ صاحب ترجمۂ گیتا کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "طالب علمی کے زمانے میں میں نے فیضی کا ترجمہ پڑھا تھا۔ اس کے اکثر برجستہ اشعار ذہن پر ثبت ہو گئے۔"

فارسی میں یہ منظوم ترجمہ اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے مقبول ہوا اور اس کے دو تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غالباً اسی سے متأثر ہو کر اردو شعرا بھی گیتا کے منظوم ترجمے کی طرف مائل ہوئے۔ لیکن جدید تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کے مترجم فیضی نہیں بلکہ مسیح پانی پتی ہیں[1]۔ اس ترجمے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زبان شستہ، ابیات برجستہ اور بندشیں چست ہیں۔ عربی و فارسی تراکیب و محاورات اور تصوّف کی مانوس اصطلاحات بڑی آزادی سے برتی گئی ہیں (جیسے حُسنِ انسل علم الیقین، مزرعۂ آخرت، ریاضِ جناں، حور و قصور تحت الثریٰ، فوق السماء وغیرہ)۔ حسبِ ضرورت سنسکرت کی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں (جیسے مہارتھی، سنیاس یوگ، رشی وغیرہ) لیکن ترجمہ آزاد ہے۔ مترجم نے ترتیب وار ہر شعر کا ترجمہ کرنے کی کاوش نہیں کی بلکہ ہر باب کا مفہوم نظم کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ کہیں تو تفسیری پھیلاؤ ہے، کہیں بے جا اختصار۔ اگرچہ خلیفہ صاحب نے اپنے ترجمے میں اتنی آزادی تو نہیں برتی لیکن چونکہ اسے (فیضی کا کارنامہ سمجھتے ہوئے) قابلِ تقلید نمونہ قرار دے چکے تھے۔ لہٰذا ان کے ترجمے میں اس کی خوبیاں اور خامیاں بڑی حد تک آگئی ہیں۔

خلیفہ صاحب کی شاعری سے اس ادھورے تعارف کے بعد، جب ۱۹۶۷ میں عزیزہ ممتاز مرزا نے میری نگرانی میں خلیفہ صاحب پر ایم۔ اے کا مقالہ لکھنا شروع کیا

---

[1] ملاحظہ ہو بھگوت گیتا، مترجمہ محمد اجمل خاں۔ علی گڑھ۔ طبع دوم ۱۹۵۹، ص ۱۳۔ اگرچہ فیضی نے مہابھارت کے کچھ حصے کا ترجمہ کیا تھا اور اسی زمانے میں بھگوت گیتا کے نثری ترجمے بھی ہوئے، لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت یا خود منظوم ترجمے میں کوئی داخلی شہادت موجود نہیں جس کی بنا پر اسے فیضی سے منسوب کیا جا سکے۔ تعجب ہے کہ محققِ فیضی، ڈاکٹر اے۔ ڈی ارشد نے ان تمام حقائق کو تسلیم کرنے کے باوجود خواہ مخواہ اسے فیضی کے سر منڈھنے کی کوشش کی ہے۔ (ملاحظہ ہو مقالہ: فیضی از ڈاکٹر اے۔ ڈی ارشد۔ (غیر مطبوعہ) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ ص ۱۸۹ تا ۱۹۲۔

تو میں نے تاکید کی کہ مختلف رسائل سے ان کا مطبوعہ کلام، جس قدر ہو سکے جمع کیا جائے۔ مقالہ نگار کی فتوحات کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ایک دن انھوں نے ایک ضخیم دفتر لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ کلیاتِ حکیم کا ٹائپ کیا ہوا نسخہ تھا۔ خلیفہ صاحب کی شخصیت سے دیرینہ نیازمندی کی بنا پر اس مجموعے کی دریافت میرے لیے "گنجِ بادآورد" کے حصول سے کم نہ تھی۔ جب میں نے اس کی ورق گردانی شروع کی تو ٹائپ کی بے شمار غلطیاں نظر آئیں۔ جہاں کہیں مسودے کے الفاظ پڑھے نہیں گئے، وہاں یا تو جگہ خالی چھوڑ دی گئی یا ایسے لفظ رکھ دیئے گئے جن سے شعر معمہ بن گیا۔ طویل نظموں کے اشعار کہیں تو بے ترتیب ٹائپ ہوئے، کہیں دوسری نظموں کے اشعار میں گڈمڈ ہو گئے۔ غرضکہ ایک شیرازۂ پریشاں تھا جس کی مناسب ترتیب و تہذیب ضروری تھی۔ معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب کی دختر، محترمہ ڈاکٹر رفیعہ حسن کے ایما سے بعض اربابِ نظر نے اس نسخے کی اصلاح کی جانب توجہ فرمائی۔ کہیں کہیں پنسل کے کچھ نشانات نظر آئے لیکن یہ سلسلہ بھی چند ابتدائی صفحات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ میں نے سوچا کہ محترمہ رفیعہ صاحبہ کی اجازت کے بغیر تو اس نسخے کو چھیڑنا مناسب نہیں، لہٰذا کیوں نہ اپنے قلم سے اس کی ایک نقل تیار کر لوں اور ساتھ ہی ساتھ ٹائپ کی غلطیاں بھی درست کرتا جاؤں۔ اس طرح ایک تصحیح شدہ قلمی نسخہ مرتب ہو گیا۔ بعد میں جب ڈاکٹر صاحبہ کو اس نسخے کا علم ہوا تو انھوں نے ازراہِ نوازش وہ بیاض عطا فرمائی جس میں مصنف نے اپنا کلام خود نقل کیا تھا۔ اور بعض نظمیں جو بیاض میں موجود نہیں تھیں، ان کی مطبوعہ نقلیں بھی فراہم کیں۔ اگرچہ خلیفہ صاحب کی قلندرانہ شانِ بے نیازی، ان کے کلام کی طرح بیاض کی تسوید میں بھی جلوہ فرما تھی، تاہم مجھے اپنے نسخے کی تکمیل میں اس سے خاصی مدد ملی۔

۱۹۶۹ تک میری جانب سے اس مجموعے کی اشاعت کی کوئی تحریک نہ ہوئی۔ میں تو اپنے ہر کام میں تاخیر کا عادی ہو چکا ہوں، لیکن جب ممتاز مرزا کے مقالے کی اشاعت کا معاملہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے طے ہو گیا، تو محترمہ رفیعہ حسن کو کلامِ حکیم کی اشاعت کی فکر ہوئی۔ اتفاق سے انھی دنوں محترمی پروفیسر حمید احمد خاں صاحب

پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہو کر ادارے میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر تشریف لا چکے تھے اور میری ان خاموش حرکات سے باخبر تھے۔ موصوف کے توسّط سے ادارے کے ڈائرکٹر شیخ محمد اکرام صاحب سے ملاقات کی ایک تقریب پیدا ہوئی جب میں کلامِ حکیم کے چھ ابواب کی جداگانہ فائلوں کا پشتارہ لادے ہوئے حاضرِ خدمت ہوا تو مرحوم نے زیرِ لب تبسّم کے ساتھ پوچھا: "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا کلام قابلِ اشاعت ہے"؟ میں نے قدرے تامّل سے عرض کیا: "اس میں سے کچھ حصہ خارج کیا جا سکتا ہے"۔ فرمایا: "کچھ نہیں، بہت کچھ! آپ اس مجموعے کا تین چوتھائی (۳/۴) حصہ خارج کر کے ایک ایسا انتخاب مرتب کیجیے جو خلیفہ صاحب کے شایانِ شان ہو"۔ انھوں نے یہ بات ایسے فیصلہ کن انداز میں کہی کہ ہامی بھرتے ہی بنی۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ سارا فساد طرزِ کتابت اور اہتمامِ ترتیب و تبویب کا ہے۔ میں نے جلی قلم سے کاغذ کے ایک رُخ پر صرف ایک ایک غزل یا نظم نقل کی تھی۔ پھر انھیں اصناف یا موضوعات کے اعتبار سے چھ ابواب میں تقسیم کر کے الگ الگ فائل بنا رکھے تھے[1] اسی وجہ سے دو ڈھائی سو صفحات کا مواد پھیل کر مثنوی معنوی کے چھ دفتروں سے زیادہ ضخیم نظر آ رہا تھا۔ بہر حال انتخاب کا تو میں بھی قائل تھا۔ بیش تر غزلوں میں سے دو دو چار اشعار اور بعض صورتوں میں نصف یا نصف سے زائد اشعار نکال دیئے۔ نظموں میں ربط و تسلسل اور مرکزی تاثر کو مجروح کیے بغیر، جہاں فنی اسقام یا بے جا تکرار و طوالت نظر آئی، وہ ٹکڑے خارج کر دیئے۔ چند نظمیں کلیتہً حذف کرنا پڑیں۔ اس طرح مجموعی طور پر بجائے تین چوتھائی (۳/۴) کے صرف ایک تہائی (۱/۳) حصہ خارج ہوا ہوگا۔ دراصل خلیفہ صاحب کا کلام جتنا بھی اور جیسا بھی ہے، مقدار و معیار کے لحاظ سے زیادہ کڑے فنّی احتساب کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب دوسری مرتبہ چھ مختلف فائلوں میں

---

[1] قطعات و رباعیات کا حصہ پہلے "متفرقات" کے باب میں شامل تھا، بعد میں الگ کر دیا گیا ہے۔

بکھرے ہوئے مواد کو ایک جلد میں اکٹھا کر کے لے گیا اور صورتِ حال کی وضاحت کر دی تو شیخ صاحب مان گئے۔ لیکن غالب نامہ کے مصنّف نے "تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد" کی شرط عائد کر دی۔ فرمایا: "پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کو دکھائیے۔ وہ اس مجموعے کا جائزہ لے کر منظور فرمائیں گے تو شائع ہو جائے گا۔"

اب معاملہ ایک ایسے دیدہ ور سے آپڑا جو مصنف اور مرتّب، دونوں کے مراتب و حدود سے آشنا تھا۔ موصوف نے میرے اصولِ انتخاب و ترتیب سے تو تعرض نہ کیا، البتہ ایک ایسی حرکت پر تنبیہ کی جو جسارتِ بے جا سے کم نہ تھی۔ خلیفہ صاحب، الفاظ کے انتخاب اور در و بست میں قدرے غیر محتاط تھے۔ اپنی قلم برداشتہ رواں دواں نثر کی طرح شعر بھی برجستہ کہتے۔ لفظی تراش خراش اور فنی تشکیل و تکمیل کی غرض سے نظرِ ثانی کی زحمت شاید ہی کبھی گوارا کی ہو۔ لہٰذا اس منتخب کلام میں بھی کہیں کہیں تعقیدِ لفظی اور متروکاتِ سخن کی کھٹک محسوس ہوئی۔ میں نے یہ کیا کہ ایسے مقامات پر انہی کے لفظوں کی نشست و ترکیب بدل کر شعر کی چولیں درست کر دیں۔ بعض صورتوں میں جہاں اس ہیر پھیر سے کام چلتا نظر نہ آیا، وہاں خفیف سی لفظی ترمیم بھی روا رکھی۔ لیکن جب محترم خان صاحب کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مرحوم ایسی آن بان کے بزرگ تھے کہ اپنی تحریروں میں ایک شوشے کی تبدیلی بھی گوارا نہ فرماتے، تو اپنی اس کاوشِ بے جا پر بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مجھے یہ جرأت محض اس لیے ہوئی، کہ اس سے پہلے خلیفہ صاحب کی بیاض پر جرّاحی کا عمل بڑی بے دردی سے کیا جا چکا تھا، بلکہ ٹائپ والے نسخے کے کچھ اوراق بھی داغدار ہو چکے تھے۔ بہر حال، اب خان صاحب کی ہدایت کے بموجب، پیشِ نظر نسخے کا متن تمام دخیل عناصر سے پاک ہے۔

کسی شاعر کے کلام کی تدوین و ترتیب کا سب سے مناسب طریقہ تو یہ ہے کہ حتی الامکان تاریخِ تصنیف کے سلسلے کو ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ کلامِ حکیم کی زمانی ترتیب ممکن نہ ہو سکی۔ مجبوراً سب سے پہلے اصناف کے اعتبار سے غزلیات،

قطعات اور رُباعیات کو الگ الگ جمع کیا گیا۔ نظموں کی ترتیب و تبویب میں قدرے دشواری پیش آئی۔ فنی کوتاہیوں کے باوجود خلیفہ صاحب کے کلام میں خیالات و احساسات کی تازگی اور موضوعات کی رنگا رنگی کا جو عالم ہے وہ اتنے ہی صفحات (یا اشعار) کے کسی اور مجموعۂ کلام میں (باستثنائے دیوانِ غالب اور "بانگِ درا") شاید ہی کہیں نظر آئے۔ لیکن نظموں میں موضوعات کے اس تنوع کے باوجود فکر و احساس کے کچھ سلسلے اور دائرے ہیں، اگرچہ یہ دائرے کہیں مبہم اور مخلوط معلوم ہوتے ہیں۔ بالآخر بڑے رد و کد کے بعد جو ابواب قائم کئے گئے اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

پہلے باب ("فکرِ رنگین") میں، بہ ترتیب ردیف، غزلیات درج ہیں - ان میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو بیاض اور ٹائپ کے نسخے میں، ردیفوں کو عنوان بنا کر نظموں کے ساتھ شامل تھیں۔ خلیفہ صاحب کی غزلوں میں تغزّل کا رنگ تو بہت ہلکا ہے لیکن شاعر کی حکیمانہ نکتہ سنجی اور عارفانہ سوز و مستی اس کی کمی کی تلافی کر دیتی ہے۔ خواجہ میر درد، اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر مانے جاتے ہیں۔ اگر بغور مطالعہ و تجزیہ کیا جائے تو ان کے مختصر و منتخب دیوان کا کثیر حصہ بھی (اور یقیناً سب سے زیادہ جاندار حصہ) عشقِ مجازی کی کیفیات میں ڈوبا ہوا ہے۔ خلیفہ صاحب کے یہاں تصوّف کا عنصر غالب ہے اور مجاز اگر ہے بھی تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ دوسرے باب (سوز و ساز) کی نظمیں، زندگی کے گوناگوں تجربات و مشاہدات کی ترجمان اور شاعر کے حساس دل کا آئینہ ہیں۔ تیسرے باب ("خاک و افلاک") کی نظموں میں حیات و کائنات، ارتقا و انقلاب کے بنیادی اصولوں پر تبصرے کیے گئے ہیں۔ یہاں خلیفہ صاحب کے ہمہ گیر فکر و تخیل کے ہاتھوں کہیں تو قدیم فلسفے کے ڈانڈے جدید ترین نظریاتِ زمان و مکان سے مل گئے ہیں، کہیں ویدانت کی ماورائیت، اسلامی ذہن و شعور کی حقیقت پسندی کے آگے سربسجود ہے اور کہیں حافظ شیرازی علامہ اقبال سے بغل گیر نظر آتے ہیں۔

چوتھے باب ("ذوقِ نظر") کی نظمیں جمالِ فطرت کے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ پانچویں باب (فن و فنکار) میں فنونِ لطیفہ کے تخلیقی عمل، ان کے باہمی رشتوں اور فن کار کے

منصب و مقام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹے باب (متفرقات) میں مختلف سلسلوں کی دو دو چار چار نظمیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ساتواں اور آخری باب قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے۔

اس مجموعے میں خلیفہ صاحب کے زمانۂ طالب علمی سے لے کر آخری دور تک کا کلام شامل ہے لیکن اس کا بیش تر حصّہ زمانۂ قیام حیدر آباد (۱۹۱۸ تا ۱۹۴۳) کی بے تکلف ادبی صحبتوں کی یادگار ہے۔ اگرچہ وہ باضابطہ طور پر شاعر نہیں تھے اور انھوں نے شعرا کے زمرے میں اپنے آپ کو شامل نہیں کیا، لیکن شعر گوئی کا ذوق انھیں فطری طور پر ودیعت ہوا تھا۔ ان کی شاعری کی اٹھان بڑی امید افزا تھی۔ ابتدائی دور کی ایک طویل نظم بہ عنوان "غالب" رسالہ مخزن میں شائع ہوئی تھی (جس کے منتخب اشعار پانچویں باب "فن و فنکار" میں درج ہیں) اس نظم میں غالب کو خراجِ تحسین ادا کرنے کے لئے غالب ہی کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا تاجور نجیب آبادی نومبر ۱۹۱۸ کے مخزن میں لکھتے ہیں:

"خلیفہ صاحب پنجاب کے ان قابلِ قدر ہونہار نوجوانوں میں ہیں جن پر علمی دنیا ناز کرے گی۔۔۔ قدرت کی فیاضیاں دیکھیے کہ خلیفہ صاحب کو شاعری کی دنیا میں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو جہان فلاسفی میں۔ ڈاکٹر اقبال کے بعد پنجاب بھر میں آپ سے بہتر کوئی شاعر نہیں۔"

اسی زمانے کی ایک اور نظم میں اقبال کی ہم نوائی کا انداز ملاحظہ ہو:

کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر | بارشِ نیرِ حوادث میں جگر پیدا کر
قطرہ آغوشِ تلاطم میں گہر بنتا ہے | آبرو چاہے تو طوفان میں گھر پیدا کر
تیغِ ہستی کے لیے سنگِ فساں ہے پیکار | راہ ایمن ہے تو خود اس میں خطر پیدا کر

خلیفہ صاحب کا ابتدائی کلام دیکھ کر یقیناً مولانا تاجور جیسے اہلِ نظر کو یہ توقع پیدا ہوئی ہوگی کہ یہ نوجوان شاعر آئندہ اقبال کی جانشینی کا شرف حاصل کرے گا۔ یہ توقع کیوں پوری نہ ہو سکی؟ علامہ اقبال کی طرح خلیفہ صاحب بھی مشرق و مغرب کے فلسفے پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فضیلتِ علمی اور ذہنی و فکری صلاحیتوں کے لحاظ

سے انھیں اپنے معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ مسائل تصوّف میں ان کے عرفان و بصیرت سے علما و محققین بھی استفادہ کیا کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو اعلیٰ ترین فن کاروں کا خاصّہ ہیں مثلاً ذوقِ جمال، جودتِ فکر، لطافتِ احساس، کشادہ ظرفی، دنیوی جاہ و ثروت سے قلندرانہ بے نیازی اور ان سب سے بڑھ کر انسانی ہمدردی کا بے پایاں جذبہ۔ لیکن اگر کمی تھی تو اس "ملہمانہ جنون" کی جو ہر فطری شاعر کا مقدر ہوتا ہے، فن سے اس گہری وابستگی، اس دُھن اور لگن کی جو ایک متشاعر کو بھی استادِ فن بنا دیتی ہے۔ شعر گوئی اُن کی فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا نہ تھی بلکہ مَن کی ایک ترنگ، تفنّنِ طبع کا ایک مشغلہ تھی۔ چنانچہ زندگی کے آخری دور میں، وہ مُلک و ملّت کی گراں قدر علمی و فکری خدمات میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ فرصت و فراغت کا یہ مشغلہ تقریباً ختم ہی ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مجموعۂ کلام، خلیفہ صاحب کی عظیم شخصیت کا ایک نقشِ ناتمام ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اس مختصر مجموعے میں ان کے دردمند دل اور ان کے متوازن و متحرک ذہن کے جتنے گوشے بے نقاب ہوئے ہیں، اتنے ان کی وقیع و ضخیم تصانیف میں بھی نہیں ہو سکے۔

افتخار احمد صدیقی
اُستاد شعبۂ اُردو
یونیورسٹی اورینٹل کالج،
لاہور

ترتیب

۳- "خاک و افلاک"

ترتیب

۴- "ذوقِ نظر"

۵- "فن و فنکار"

۱

"فکرِ رنگیں"

کھوئے جاتے ہیں فکرِ رنگیں میں
شاعری کی شراب نے مارا

حکیم

○

آنکھ جس سمت اُٹھائی ترا کعبہ دیکھا
ذرّے ذرّے کو یہاں ناصیہ فرسا دیکھا

ہے تری راہ میں ہر ایک قدم چشمۂ نور
ہم نے ہر نقشِ قدم کو یدِ بیضا دیکھا

ہم نے ہر ذرّے کو اک دیدۂ مجنوں پایا
ہر نظر گاہ کو اِک محملِ لیلیٰ دیکھا

جس کو دعویٰ ہے کہ ہوں خلوتِ جاں میں مستور
شوقِ جلوت میں اُسے انجمن آرا دیکھا

پھول کا رنگ ہو یا طائرِ گلشن کی ترنگ
ہم نے ہر رنگ میں اظہارِ تمنّا دیکھا

ہے فنا اور بقا زیر و بمِ موجِ وجود
جس کا ساحل ہی نہیں ہم نے وہ دریا دیکھا

○

تُو نے نالوں کو جو سینے میں سنبھالا ہوتا
عرش تک ضبط کی قوت سے اُچھالا ہوتا

غیر میں بھی نظر آتی تجھے اپنوں کی جھلک
سُرمہ وحدت کا کبھی آنکھ میں ڈالا ہوتا

خاکساری سے جو کرتا نظر افروزیِ دل
ساغرِ جم بھی مٹی کا پیالہ ہوتا

بزمِ مہر و مہ و انجم میں ہے رونق تم سے
پرتوِ عشق سے ہے حُسن دو بالا ہوتا

دہر میں راہ بتانا نہیں کافی اے خضر!
کوئی کانٹا کسی پاؤں سے نکالا ہوتا

بحر کی تہ میں گہر، دشت میں اک تنہا پھول
کہتے ہیں کاش کوئی دیکھنے والا ہوتا

○

موجِ رواں ہے زندگی، گر کے بھی سر اُٹھائے جا
لعل و گہر کا بن چراغ، باد میں جگمگائے جا

چھوڑ دے فکرِ بیش و کم، کیا ہے جہاں کا رنج و غم
عشق سے دل میں نور کر، حُسن سے لَو لگائے جا

کس نے کہا کہ تا بہ مرگ خُلد کا انتظار کر
خاک کی ہے یہ آرزو خُلد مجھے بنائے جا

مثلِ صدف چھُپا نہ رکھ، گر ترے پاس ہے گُہر
ابرِ بہار بن، برس، اپنے گُہر لُٹائے جا

لُطف و کرم ہے سَرمدی، جَور و ستم ہے سرسری
لُطف و کرم کو یاد رکھ، جور و ستم بھُلائے جا

○

یُوں عشق کو آشکار کرنا
دشمن کو بھی دل سے پیار کرنا

دل عشق سے ہو گیا اگر مست
پھر مت اسے ہوشیار کرنا

کھائے ہیں جو اتنے داغ اے دل
پیدا کوئی لالہ زار کرنا

کیا کیا نہ دیے ہوس نے دھوکے
اب اس پہ نہ اعتبار کرنا

وہ خود ہی تمہاری طرف بڑھیں گے
ہاں صبر سے انتظار کرنا

تجھ بن جو گزر گئے ہیں وہ دن
یارب نہ انھیں شمار کرنا

○

جان و جاناں میں امتیاز ہے کیا — کون کھولے اسے یہ راز ہے کیا
عشق کو حُسن سے ہے کیسا ربط — ناز سے رشتۂ نیاز ہے کیا
ظرفِ ہستی کو توڑ کر نکلی — عشق کی مے قدح گداز ہے کیا
ذرّہ ذرّہ ہوا ترنم ریز — ساری دنیا ہی تیرا ساز ہے کیا
تُو ہی ظاہر ہے تُو ہی باطن ہے — اس حقیقت میں پھر مجاز ہے کیا
تجھ میں پردہ نشیں ہے کون اے ساز — تیری آواز دل گداز ہے کیا
آستانے سے سر نہیں اُٹھتا — عاشقوں کی یہی نماز ہے کیا

ہم بھی امیدوار ہیں واعظ
درِ رحمت تجھی پہ باز ہے کیا

○

ملوث عکس سے آئینۂ روشن نہیں ہوتا
کہ رہ کر بحر میں بھی خضر تر دامن نہیں ہوتا

ہے تسخیرِ خودی تمہیدِ تسخیرِ جہاں اے دل
جو خود افگن نہ ہو پہلے جہاں افگن نہیں ہوتا

مری طبعِ رواں ہے ساحل و منزل سے بیگانہ
درونِ بحر موجوں کا کوئی مسکن نہیں ہوتا

وہاں نظروں میں سارا گلشن ایجاد صحرا ہے
جہاں اے عشق سینے میں ترا گلشن نہیں ہوتا

یہاں ہر قطرۂ خونِ جگر لعلِ معانی ہے
جگر کاوی نہیں ہوتی تو حُسنِ فن نہیں ہوتا

○

نِکل رہی ہے سحر کا سبُو شراب اُٹھا
مثالِ صبح ہتھیلی پہ آفتاب اُٹھا
کشش سے تیری ہے مد اور جزر دریا میں
دلوں کی موج بھی اے رشکِ ماہتاب اُٹھا
سکونِ جاں ہے جمادات یا ملک کو نصیب
مجھے ہے حکم کہ تو کیفِ اضطراب اُٹھا
اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہوں بحرِ ہستی میں
مثالِ موج شکستوں سے کامیاب اُٹھا
رُموزِ دہر کے ہے انکشاف کی کوشش
کتابِ عقل اُٹھاتی ہے تو رباب اُٹھا
نیاز مند ہوں لیکن نہیں ہوں بے جوہر
مری طرف بھی کبھی چشمِ انتخاب اُٹھا

○

عشق کے اضطراب نے مارا — علم کے پیچ و تاب نے مارا
ہے حجاب اِک نظر کی کوتاہی — ہم کو اپنی نقاب نے مارا
دل کی لائی ہوئی ہے ہر آفت — اسی خانہ خراب نے مارا

ہم تو تیرے کرم کے کُشتہ ہیں — کس کو تیرے عتاب نے مارا
آرزو نے بہت دیے دھوکے — اس فریبِ سُراب نے مارا
شیخ کرتا کبھی نہ کچھ لیکن — اس کو خوفِ حساب نے مارا

کھوئے جاتے ہیں فکرِ رنگیں میں
شاعری کی شراب نے مارا

○

محفل میں اس کی جا کے مَیں خاموش ہو گیا — جو سوچ کے گیا تھا فراموش ہو گیا
احسان زندگی کا اٹھاتا کہاں تلک — سر کٹ گیا تو مَیں بھی سبک دوش ہو گیا
پردہ تھا شرم کا یہ سیاہی گناہ کی — مَیں ظلمتِ گناہ میں رُوپوش ہو گیا
سمجھو کہ جیتے جی ہی وہ پہنچا ہے خلد میں — تیرے خیال سے جو ہم آغوش ہو گیا

اب ہم کو اس کی سمع خراشی سے ہے نجات
ناصح کو کہہ دیا "مَیں گراں گوش ہو گیا"

○

جگرِ سوختہ بُلبُل کی نوا کی قیمت — خونِ دل پھول کی رنگین قبا کی قیمت
فطرتِ دہر ہے عادل نہیں عاجل لیکن — مل ہی جائے گی کبھی مہر و وفا کی قیمت
ستمِ دہر جُدا، دل کی کشاکش ہے جُدا — ہائے کیسی ہے گراں، طبعِ رسا کی قیمت
شیخ صاحب کو ہے جنّت کی تمنّا، کیا خوب! — پوچھیے اُن سے ادا آپ نے کیا کی قیمت
کفر اس کو نہ سمجھنا، یہ ہے ایمان کی بات — مفت وہ بھی نہ ملے گا، ہے خدا کی قیمت

دہر میں کوئی نہ باقی، نہ کوئی فانی ہے
جو بقا چاہے نکالے وہ بقا کی قیمت!

○

یم دل میں ہے کیسا جزر اور مَدّ — وہی دل ہے کبھی نیک اور کبھی بَدّ
محبّت کو حیاتِ جاوداں دے — مری جاں حُسن گر تیرا ہے بے حَدّ
حیاتِ آدمی چشمک شرر کی — دیا ہے کیوں ابد پیوند مقصَدّ
کلیدِ عقدۂ مشکل ترا نام — وگرنہ زندگی ہے قفلِ ابجَدّ
مَیں حُسنِ بے کراں کا کیا کروں ذکر — وہ آزاد اور ہیاں میرا مقیَّدّ
طوافِ کعبہ و بُت خانہ تا کے — بنالے اپنے اندر ایک معبَدّ

جہاں سے زندگی ہے موجزن سب
وہیں سے ہے مرے شعروں کی آمد

○

ہے دردِ عشق میں کوئی لذت نہاں ضرور
ورنہ کسی کو ہوتا ہے آزار بھی پسند؟

کچھ کچھ تمہاری چال سے ملتی ہوئی تھی چال
آئی ہمیں زمانے کی رفتار بھی پسند

دونوں میں تیرے ناز کے انداز ہیں جُدا
اقرار بھی پسند ہے انکار بھی پسند

پہنچے گا جا کے منزلِ مقصود پر وُہی
آساں کے ساتھ جس کو ہے دشوار بھی پسند

رحمت کی وسعتوں سے عجب کیا ہے زاہدو!
میرے کریم کو ہوں گنہ گار بھی پسند

○

ہے تو ہی باطن اور تو ہی ظاہر ہے تو ہی اوّل اور تو ہی آخر
کیا بات تجھ سے دل کی چھپائیں ہر جا پہ حاضر ہر شے کا ناظر
خود رازِ تیرا ہم سے چھپے کیا ہو ذرّہ ذرّہ جب تیرا مخبر
قبلہ ہے تو اور قبلہ نما دل منزل ہے تو ہی ہم سب مسافر
تجھ ہی سے سب کی اُمّید قائم کافر ہی ہو گا افسردہ خاطر
موجود تجھ سے باہر نہیں کچھ!
چھوڑیں جو تجھ کو جائیں کہاں پھر

○

زمانہ کچھ نہ دے گا سیدھے ہاتھوں ملا کچھ تو ملے گا لڑ جھگڑ کر
بہت گہرا ہے اُس عاصی کا تقویٰ جو راہِ راست پر آیا بگڑ کر
کہیں کچھ ہاتھ آیا جب تو زاہد الگ بیٹھے ہیں دنیا سے بگڑ کر
نہیں مایوس اپنی قوم سے میں
بسے گی پھر یہ بستی بھی اُجڑ کر

○

مرے سینے میں اک خلوت کدہ ہے یہاں سے ہے جہاں کا شور و شر دور
ہے پروازِ محبت لامکاں تک اُڑا کر لے گئے یہ بال و پر دور

نہیں ملتی ہے دولت جاودانی ۔ نہ ہو گر دل سے حرصِ مال و زر دُور
وہ جانِ جاں ہے ہر شہ رگ سے نزدیک ۔ ہے پھر بھی کس قدر اس سے بشر دُور
تِرا مقصود ہے تیری بغل میں ۔ تلاشِ یار میں مت کر سفر دُور
یہی رشتہ ہے بس جان و جہاں میں ۔ نہیں ہے بحر سے آبِ گہر دُور

ہر اک ذرّہ ہے تیرا آستانہ
رکھیں کس طرح اس چوکھٹ سے سر دُور

○

ایک وہ غم کہ جاں نواز، ایک وہ غم کہ جاں گداز
ایک وہ غم کہ خانہ سوز، ایک وہ غم کہ کارساز
ایک وہ غم کہ روح میں حُسنِ ازل کی ہے طلب
ایک وہ غم کہ چشمہ ہے جس کا جہانِ حرص و آز
ایک وہ غم کہ جس پہ سب باب ہیں زندگی کے بند
ایک وہ غم کہ جیتے جی خُلد کے دَر ہیں جس پہ باز
غم میں ہے علم و حِلم سے سُرعتِ سیر کا ظہور
معرفتِ حیات کی راہ وگرنہ ہے دراز
ذوقِ طرب کو کیا خبر غم کے سرور و سوز کی
زیر و بمِ سرودِ جاں اس کا نشیب اور فراز

○

یہ مانا کشمکش ہے جزوِ ہستی
مگر اپنوں سے یہ پیکار کب تک
مکدر ہو گیا آئینۂ دل
رہے گا اس پہ یہ زنگار کب تک
متاعِ تاجرانہ ابنِ آدم
بکیں انسان سرِ بازار کب تک
کہاں تک لعنتِ سرمایہ داری
خزانوں پر رہیں گے مار کب تک
جو قومیں تھک تھکا کر سو گئی ہیں
وہ ہوں گی اے فلک بیدار کب تک
اُبھرنے کی کوئی تدبیر کر شیخ
کرے گا وعظ تو بے کار کب تک
غمِ بے جا نے قوّت سلب کر لی
فغان و نالہ ہائے زار کب تک

○

انسان کو ازل سے ملا بے قرار دل
بے تاب برق کی طرح بے اختیار دل
ہر ذرّہ ایک دل ہی، ہر اک قطرہ ایک دل
سب بحر و بر میں پھیل گئے بے شمار دل
ناپائدار حُسن ہے اور بے وفا ہے دہر
کس شے پہ اب کرے گا بھلا اعتبار دل
جس شعلۂ ہوس نے جلایا ہزار بار
پروانہ وار اس پہ گرا بار بار دل
تسخیرِ مہر و ماہ کا رکھتا تھا حوصلہ
اس صید گاہ میں ہوا خود ہی شکار دل
حق نے اسے بنایا غمِ عشق کے لیے
دھوکے میں کھا رہا ہے غمِ روزگار دل
ہر شے میں دیکھتا ہے جھلک حُسنِ یار کی
اب تو ہر ایک چیز کو کرتا ہے پیار دل

یہ سوسن و نسترن، یہ سنبل — مے خوارِ بہار لالہ و گُل
گُل ہی سے نکل رہا ہے ہر جزو — ہر جزو بنے گا ایک دن گُل
صہبائے حیات تھی بہت تیز — شیشے بھی شراب میں گئے گُھل
واقف ہے نوائے راز سے دل — گل میں بھی نوا ہے مثلِ بُلبُل
باطن میں سکوت اور سکوں ہے — ظاہر میں بہت ہے شور اور غُل
ہے عشق لطافت آفرینی — جاتی ہیں کثافتیں یہاں دُھل
کونین ندی، کے دو کنارے
ہے موت عبور کے لیے پُل

○

زمین و آسماں شام و سحر گم — مرے دانے میں ہیں یہ سب ثمر گم
مری خلوت میں لاکھوں جلوتیں ہیں — اقامت میں مری لاکھوں سفر گم
معانی دل میں، اختر آسماں پر — مگر ہے رشتۂ سلکِ گہر گم
تمیز عیب و ہنر کی اعتباری — ہیں ہر اک عیب میں کتنے ہنر گم
نظر سے پا لیا سب ماسوا کو — ہے اپنی دید میں لیکن نظر گم
سکونِ دل ہے اک تمہید پرواز — کسی بیضے میں ہوں جس طرح پر گم
بڑی کاوش سے ہاتھ آئے ہیں یہ لعل
ہے ہر اک شعر میں خونِ جگر گم

○

اے مری جانِ ناتواں تجھ پہ ہے اعتبار کم
جبرِ حیات بے کراں، قدرت و اختیار کم

گُل اسی غم سے سینہ چاک، لُطف یہاں اٹھائیں خاک
دردِ غمِ خزاں دراز، فرصتِ نوبہار کم

ابرِ سیاہ دَل کے دَل، چشمکِ برق ایک پَل
سنگ کی تیرگی دبیز روشنیٔ شرار کم

ریگِ رواں کا ہے وفور، چشمۂ آب دُور دُور
وسعتِ خارزار بیش، کشورِ لالہ زار کم

اہلِ ہوس کا ہے ہجوم، نوعِ مگس کا ہے ہجوم
طالبِ حُسن بے شمار، عاشقِ جاں نثار کم

محملِ یار ہو گیا قیس کی آنکھ سے نہاں
دشتِ جنوں میں دیر تک ہو نہ سکا غبار کم

لمحے سکوں کے چند ہیں کشمکشِ حیات میں
کُلفتِ دہر بے حساب، لذّتِ روزگار کم

○

تھی صبوحی سحر کے منظر میں مے ملی ہم کو کاسۂ زر میں
زندگانی ہے آپ پیکر ساز کیوں مقید ہو ایک پیکر میں

کیسی ساغر گداز ہے صہبا — کبھی ٹھہری نہ ایک ساغر میں
دل نے دنیا نئی بنا ڈالی — نہیں عالم یہ ہفت کشور میں
ہے سکوں اضطراب زائیدہ — جوشِ دریا ہے آبِ گوہر میں
عرقِ سعی بر جبینِ حیات — اور کیا ہے نمودِ اختر میں
تلخیِ بادۂ حیات کا لطف — نہیں شاہوں کے کاسۂ زر میں
دل کے آئینے میں ہے جو صورت
نہیں آئینۂ سکندر میں

○

ہے شوخی دانۂ نخل آفریں میں — نہ ٹھہرے گا یہ آغوشِ زمیں میں
یہ سب جلوے ہیں اس دل کی بدولت — ہے مہر و ماہ کا مرکز ہمیں میں
نگہ پردہ کشا تیری اگر ہو — ہزاروں عرش ہیں تیری زمیں میں
گناہوں نے جو کی آدم میں پیدا — نہیں شوخی وہ جبریلِ امیں میں
جو تیرے گیسو و رُخ میں ہے رشتہ — وہی رشتہ ہے شاید کفر و دیں میں
نشاط آباد میں ڈھونڈا نہ پایا!
جو گوہر تھا دلِ اندوہگیں میں

○

میں بحرِ بے کنار ہوں، ساغر نہیں ہوں میں — خود موجِ زندگی ہوں شناور نہیں ہوں میں

مجھ پہ نہیں ہے گردشِ ایام کا اثر
مَیں لامکاں کا نُور ہوں، اختر نہیں ہوں مَیں

ہے شغل میرا صیقلِ آئینۂ وجود
آئینہ سازِ مثلِ سکندر نہیں ہوں مَیں

یہ خاک و آب و باد ہے بازیچہ گاہِ جاں
اس خاک و آب و باد کا پیکر نہیں ہوں مَیں

دل کیا ہے موجِ نُورِ ازل کی ہے اک گرہ
بنتا ہے جو صدف میں وہ گوہر نہیں ہوں مَیں

مجھ کو بھلا حقیقتِ عُریاں سے کیا دریغ
افسانہ باف و واعظِ منبر نہیں ہوں مَیں

○

رُوحوں کا مقام ہے خدا میں
باقی ہیں سب ایک کی بقا میں

ہے تو ہی مجاز کی حقیقت
جلوہ ہے ترا ہی ماسوا میں

ہر لحظہ نو بہ نو تری شان
راز اور نہیں ہے کچھ فنا میں

باطن میں وہی ہے لذّتِ شوق
ظاہر ہے جو حُسنِ خودنما میں

رِندوں میں ہے تجھ سے جوشِ مستی
پاکیزگی تیری پارسا میں

خالی رہا تاجِ شہ کا کچکول
مَے پڑ گئی کاسۂ گدا میں

○

آگاہِ ذاتِ ہو کے اگر مَیں کو تُو کریں
دریا سے ہم کنار ہی آبجُو کریں

تیرے حریمِ قدس میں ہے لذّتِ سکوت
مستوں کو حکم ہے نہ یہاں ہاو ہُو کریں

گُل سو زبان رکھتا ہے لیکن خموش ہے ۔۔۔ کیا اِک زبان لے کے تری گفتگو کریں
ارض و سما میں ہے مئے بے شیشہ موجزن ۔۔۔ ہم کس لیے نظر سُوئے جام و سبُو کریں
گرچہ مری خودی میں بھی تیرا ہی نُور ہے ۔۔۔ اپنا چراغِ مہر کے کیا رُو برو کریں
شاید تری تلاش میں اس سے مدد ملے
پہلے کچھ اپنے آپ کی ہم جستجو کریں

○

نامحرموں سے رہتی ہے فطرت حجاب میں
شام و سحر چھپاتی ہے رُخ کو نقاب میں
پڑتی نہیں ہے گوہرِ نایاب پر نظر
خس کی طرح سے اُلجھے ہیں موج و حباب میں
بیرونِ در پُکار رہے ہیں عبث اُسے
اِک حرف بھی سنیں گے نہ ہرگز جواب میں
محرم ہو تو تُو قطرۂ شبنم میں بھی ملے
جو حُسن جلوہ گر ہے مہ و آفتاب میں
شاعر نے رنگِ جوئے شفق میں وہ پالیا
مے کش جو ڈھونڈتا رہا گلگوں شراب میں
ہستی نے اپنا دل مرے دل سے ملا دیا
دھڑکن اسی کی ہے مرے ہر اضطراب میں

سینے میں میرے ایک ترنم کی موج ہے
جو لہر پڑ رہی ہے وہاں جوئے آب میں

خاموش سا سوال ہے خاموش سا جواب
رازونیاز دیکھ سوال و جواب میں

○

دُور بھٹکے دلِ حزیں نہ کہیں!
چھُپ کے بیٹھے ہوں وہ یہیں نہ کہیں

تو بھی ہرجائی ہم بھی ہرجائی
دیکھ لیں گے تجھے کہیں نہ کہیں

بارہا شک ہُوا ملائک کو
عرشِ اعظم ہو یہ زمیں نہ کہیں

تیرا انکار ہے فزونیٔ ذوق
"ہاں" ہو تیری "نہیں نہیں" نہ کہیں

نفسِ سرکش کا سر کچل ڈالو
یہ بنے مارِ آستیں نہ کہیں

○

کس نے کہا کہ تُو ہے وہاں اور ہم یہاں
سب کائنات دل میں ہے، سب ہے بہم یہاں

فردوس بھی نہیں ہے کوئی دُور کا مقام
سَو بار ہم نے دیکھا اُسے صبح دم یہاں

سازِ ازل سے ہے جو نکلتی نوائے راز
اس کا سکوت میں بھی سُنا زیر و بم یہاں

اہلِ نظر کو جُز میں تماشائے کُل نصیب
ہے ساغرِ حباب بھی اِک جامِ جم یہاں
ہر دم تراشتی ہے وہ آئین نئے نئے
تقدیر لے کے پھرتی ہے لوح و قلم یہاں
زیرِ نقابِ پردۂ حاضر ہے غیب بھی
ہم دوش ہو گئے ہیں وجود و عدم یہاں
دو عالموں میں رہتا ہے انسان ایک دم
یعنی کہ اک قدم ہے وہاں، اک قدم یہاں
تسبیح خواں ملک بھی ہیں بُلبل کے ہم نوا
ہے قدسیانِ عرشِ بریں کا حرم یہاں

○

کام نہ آسکیں مرے عقل کی پاسبانیاں
عشق کی رَو میں بہ گئیں سب مری نکتہ دانیاں
ختم نہ ہو سکی کبھی عقل و جنوں کی کشمکش
عشق کی ہر روش سے ہیں عقل کو بد گمانیاں
شکوۂ جَور کچھ نہیں، شکر ہے اور کچھ نہیں
تیرے ستم میں بھی نہاں تھیں تری مہربانیاں
یادِ سرودِ رفتہ ہے تیری صدائے بازگشت
دل کو ہیں مایۂ سرور گزری ہوئی کہانیاں

آہ یہ زُہدِ نارسا، اب ہوئے جا کے پارسا
رِندی و میکشی میں جب بیت گئیں جوانیاں

○

کٹی عمر ساری تو نادانیوں میں
رکھا کیا ہے اب ان پشیمانیوں میں
ملی ہم کو کچھ عافیت میں نہ راحت
بڑی مشکلیں تھیں تن آسانیوں میں
جہاں پر نہیں مقصدوں کی بلندی
گزرتے ہیں اوقات حیرانیوں میں
کسی حُسنِ باقی سے کر عشق پیدا
جو چاہے کہ داخل نہ ہو فانیوں میں
محبت سے ملتی ہے دل کو جو راحت
وہ حاصل نہیں ہے جہاں بانیوں میں
مرے دل میں ہے طفلِ آوارہ کی خُو
اسے رکھنا اے عقل نگرانیوں میں

○

رہتے ہیں بے حجاب ہی وہ جلوہ گاہ میں
ہے دیکھنے کی تاب بھلا کس نگاہ میں
بت خانہ ہو کہ کعبہ، کلیسا ہو یا کنشت
سنگِ نشاں بنے ہیں یہ سب تیری راہ میں
شیخِ حرم نشیں مری تسبیح دیکھنا
کتنے حسیں ستارے ہیں تارِ نگاہ میں
وہ گرمِ رَو ہوں میں کہ یہ دونوں جہان بھی
ذرّے بنے ہوئے ہیں مری گردِ راہ میں
تھا جس کا مال اس کے ہی آخر کیا سپرد
دل کو دیا ہے ہم نے اب اس کی پناہ میں
بیکارِ زندگی کے جو قابل نہیں رہا
زاہد نے سر چھپایا کسی خانقاہ میں

ہے تاجِ زر بھی سونے کا کچکول اے حکیم
پایا نہ ہم نے فراق گدا اور شاہ میں

○

ہو گیا دہر دگرگوں یہ خبر ہے کہ نہیں
انقلابوں کا ترے دل پہ اثر ہے کہ نہیں

سنگ کو آئینۂ رازِ حقیقت کر دے
دیدہ ور تجھ میں وہ اعجازِ نظر ہے کہ نہیں

کوئی آیا ہو جو واپس تو یہ پوچھیں اس سے
کشمکش دہر کی دنیا کے اُدھر ہے کہ نہیں

ایک چنگاری بھی کافی ہے بھڑک اُٹھنے کو
اب تری راکھ میں پوشیدہ شرر ہے کہ نہیں

ساحلِ آسودگیٔ جاں ہیں سکوں کا طالب
موج کہتی ہے کہ کچھ ذوقِ سفر ہے کہ نہیں

تیرے عاشق ہیں اب اک عالمِ یک رنگی میں
کیا بتائیں کہ وہاں شام و سحر ہے کہ نہیں

○

نمودِ حُسن نے اُلٹی نقاب آخر میں
اُٹھا ہے خود بخود ان کا حجاب آخر میں

نہ ہونا یاس سے دوچار اے دلِ بے تاب
سکوں سے بدلے گا ہر اضطراب آخر میں

ہے آدمی بہت عجلت پسند ورنہ یہاں
درست ہوتا ہے ہر اک حساب آخر میں

تلاشِ گوہرِ مقصود میں ثبات ہے شرط
جو باوفا ہے وہ ہے کامیاب آخر میں

جسے زمانے کا جور و ستم سمجھتے تھے
وہ بن گیا کرمِ بے حساب آخر میں

نیازمند جو تھا التفات سے محروم
وہیں پڑی نظرِ انتخاب آخر میں

ابھی صحیفۂ فطرت کے باب ہیں مُبہم
کرے گی صاف یہ مضموں کتاب آخر میں

○

کوئی ہستی نہیں یہاں جس میں
سیکڑوں گنجِ ممکنات نہیں!
دل میں اک آفتاب نکلا ہے
اب یہاں دن ہی دن ہے رات نہیں

○

اسی ظلمات میں آبِ خضر ہے
بنی ہیں رہنما میری خطائیں

○

ہجراں میں ہے بہاتا گو انتظار آنسو
ہیں وصل میں بھی گرتے لیکن دو چار آنسو
جن کے بیان سے ہے قوتِ سخن کی قاصر
ہیں اُن حقیقتوں کے آئینہ دار آنسو
دعوے محبتوں کے بے اعتبار ہیں سب
لیکن نہیں ہیں ایسے بے اعتبار آنسو
ہے آنسوؤں سے ہوتی سینے کی آگ ٹھنڈی
باہر نکالتے ہیں دل کا بخار آنسو
دھندلی سی یاد ہے کچھ مبہم سی حسرتیں ہیں
نغمے سے ہیں اُبھرتے کیوں سوگوار آنسو
ہے قبر میں اُداسی، جاں مر کے بھی ہے پیاسی
دو چار چاہتی ہے، خاکِ مزار آنسو

○

پیدا کیے چنار نے کیا بے شمار ہاتھ | بہرِ دعا زمیں نے اُٹھائے ہزار ہاتھ
خورشید تیری راہ میں ہے اک گدائے نور | پھیلا کے بیٹھتا ہے سرِ رہگزار ہاتھ
بادِ صبا کچھ اس طرح کلیوں کو چھو گئی | جیسے حسین طفل کو کرتے ہیں پیار ہاتھ
دستِ جفا کسی کے ہیں تخریب میں لگے | تعمیر کے لیے ہیں کہیں بے قرار ہاتھ
شغل ان کا ہو نہ حُسنِ عمل کے سوا کوئی | ایسے عطا کرے مجھے پروردگار ہاتھ

تدبیر کا ہے ایک ہی ہاتھ اور وہ بھی شل
قسمت کے چار سُو میں ہیں ستّر ہزار ہاتھ

○

نہ مٹا ترے کرم سے مرا دردِ نارسائی | مرا عشق ابتدائی، ترا حُسن انتہائی
کبھی اک مقام پر یہ دلِ مضطرب نہ ٹھہرا | مجھے ہو ترا گلہ کیا، یہ ہے دل کی بیوفائی
تری رحمتوں نے اس کو کیا بدرِ نور افشاں | مہِ نو نے جب بڑھایا کبھی کاسۂ گدائی
اسے دہر میں کسی سے نہیں بغض یا عداوت | جسے مل گیا ہے تجھ سے کبھی ذوقِ آشنائی

یہ عجب نہیں کرم ہو مری صاف باطنی پر
نہ قبا مری ریائی، نہ ہے جامہ پارسائی

○

دل میں ہے بہار بھی خزاں بھی | بدلے ہیں کئی سماں یہاں بھی

ہر چیز ہے یاں رواروی میں چلتے ہیں مکین بھی مکاں بھی
تغییر کا شوق بھی ہے دل کو اور ذوقِ حیاتِ جاوداں بھی
فطرت ہے کھلا ہوا سا اک راز کچھ اس میں نہاں ہے کچھ عیاں بھی
ناگفتہ بہت ہے، دل کا قصّہ ہو جاتا ہے گرچہ کچھ بیاں بھی
ماتھے ہی نہیں جھکے یہاں پر سجدے میں ہے سنگِ آستاں بھی
اضداد کی جمع ہے مرا دِل محدود بھی ہے یہ بے کراں بھی
کیا تجھ کو کہوں حکیم کیا ہے
عاشق بھی ہے اور نکتہ داں بھی

○

اندر خدا ہی، باہر خدا ہی ہے ذرّہ ذرّہ دیتا گواہی
بے عشق ہستی ہے تشنہ کامی بے عشق دل ہے بے آب ماہی
تیری طرف سب جاتی ہیں راہیں لاکھوں ہیں رستے بے انت راہی
ہے جو فقیری اختر بہ امن ایسی فقیری، بے تاج شاہی
سرکش کی نخوت ہے بے بصیرت یہ کج کلاہی، ہے کج نگاہی
دیدار تیرا خورشیدِ باطن
ہے تیری فرقت شب کی سیاہی

○

مشکل ہوئی ہے پرہیزگاری خود زندگی ہے اک بادہ خواری

پردے سے چھن کر نکلا ترا حُسن — اب بھی ہے باقی کیا پردہ داری
کچھ رازِ ہستی ہر گوشِ گُل میں — کہتی گئی ہے بادِ بہاری
اے مرگ تیری کیا ہے حقیقت — پوشاکِ کُہنہ ہم نے اتاری
دل ہے حقیقت دل اصلِ ہستی — باقی مظاہر سب اعتباری
اے شیخ تیری تسبیح مہمل — اس سے ہے بہتر اختر شماری
کرتا ہوں اس پر کیا فاصلے طے — ہے نکہتِ گُل میری سواری
دل کو کچھ آنسو رکھتے ہیں تازہ!
اس کشت کی ہے یہ آبیاری

○

تُو میرا نغمہ، مَیں تیری نے — تُو میرا نشّہ، میں تیری مے
ہیں ساز لاکھوں اور نغمہ ایک — سب زمزموں میں ہے ایک لَے
سب کو فنا اور تجھ کو بقا — سب کو شکست اور تیری ہی جے
ہر شے کی ہستی تیرا وجود — تجھ بن عدم ہے ہر ایک شے
ہر لحہ دنیا ہے نو بہ نو — آتے ہیں عالم یاں پے بہ پے
من ہی کی دُنیا من کا ہے دیس
اس میں نہ مکّہ، کاشی نہ رَے

○

مرا سوز بھی کیا حیات آفریں ہے — بسِ کوچۂ غم بہشتِ بریں ہے

غمِ دہر سے کچھ نہیں اس کا رشتہ جو حسرت لیے میری جانِ حزیں ہے
کیا خلد پیدا وہ ذوقِ نظر نے کہ رشکِ جناں اب بھی سرزمیں ہے
زمانے میں ہرگز نہیں غیر کوئی ہے بس تو ہی تو اور کوئی نہیں ہے
زمان و مکاں میں غریب الوطن ہے
خدا جانے یہ دل کہاں کا مکیں ہے

○

تمنّا ہی اس زندگانی کی خو ہے کوئی جستجو ہے، کوئی آرزو ہے
وہی ذوقِ ہستی، وہی عشق و مستی نوا عندلیبوں میں پھولوں میں بُو ہے
خودی کا ہے دھوکا کہ بس میں ہی میں ہوں خودی مٹ گئی جب تو پھر تو ہی تو ہے
تصوّر سے تیرے ہے آبادیٔ دل ترا عکس آئینے کی آبرُو ہے
نہیں تیری رحمت کی بھی انتہا کچھ زمانہ اگرچہ بہت تند خو ہے
میں ہوں اک کرن تو ہے مہرِ درخشاں
میں اک لہر تو زندگانی کی جُو ہے

○

اشک بہا کے کیوں کہوں جو ہے سو بے ثبات ہے
ذوقِ تغیرات میں تازگیٔ حیات ہے
جامۂ زندگی کا رنگ، تازہ بہ تازہ نو بہ نو
حُسنِ رُخِ حیات ہے، عظمتِ کائنات ہے

نقطۂ تیز سیر سے بن گئے دائرے یہاں
لاکھ طرح ہوئی بیاں، اصل میں ایک بات ہے
دل میں نظر فروز ہیں کثرتِ غم کی ظلمتیں
اتنی ہے تلاشِ نجم جتنی اندھیری رات ہے

سوزِ ہستی سے ہے لبریز ہر اک سازِ حیات
دل کُشا نغمہ ہے اور نغمے میں فریاد بھی ہے

ہے جس آئین سے ہر چیز کو پیغامِ فنا
اسی آئینِ تغیّر سے یہ آباد بھی ہے

گِلِ تیرہ سے نکلتا ہے یہاں پر ہر گُل
شر جسے کہتے ہیں وہ خیر کی بنیاد بھی ہے

جس کشاکش سے گریزاں ہے طبیعت میری
ہے غضب یہ، اسی پیکار سے دل شاد بھی ہے

رَہ میں ہوتی ہے رکاوٹ تو ابُھر جاتی ہے
جو مزاحم ہے مقاصد میں وہ امداد بھی ہے

یہ تناقض ہی حقیقت میں نہ ہو روحِ حیات
عشق کہیے جسے آباد بھی برباد بھی ہے

جبرِ فطرت ہمہ گیر اور مشیّت ہمہ گیر
پھر ستم یہ ہے کہ بندہ ترا آزاد بھی ہے

پہلے خود کرتے ہیں نسیان کا پُتلا تعمیر
اور پھر پوچھتے ہیں عہدِ ازل یاد بھی ہے

○

شباب آنے پہ جب انساں غلط رستوں پہ چلتا ہے
تو وقتِ شیب رہ رہ کر کفِ افسوس ملتا ہے

نہیں ہر دل ہی نالاں گردشِ ایّام کے ہاتھوں
زمانہ خود بھی ہے بے تاب اور کروٹ بدلتا ہے

کبھی دولت، کبھی شہرت، کبھی وصلِ بتاں چاہے
یہ طفلِ دل کھلونوں پہ ہی آخر تک مچلتا ہے

سنبھل رہرو جوانی کا ہے جادہ لغزش آلودہ
یہاں تو پارسا کا بھی قدم اکثر پھسلتا ہے

کبھی امرت کی لہریں ہیں کبھی آتش فشاں ہے دل
کبھی شعلہ لپکتا ہے، کبھی چشمہ اُبلتا ہے

زمینِ آرزو ہے سیر حاصل کس قدر اے دل
ہیں دو اس کی جگہ پیدا جو اک ارماں نکلتا ہے

نہیں ہے تربیت جانوں کی بے سوز و گدازِ دل
جو پہلے دل پگھلتا ہے تو پھر سانچے میں ڈھلتا ہے

مرے اشعار کی آمد ہے صہبائے محبت سے
اسی امرت کی بوندیں پی کے دل گوہر اُگلتا ہے

○

چند آنسو دیدہ و دل میں ہمارے رہ گئے
صبح ہونے کو ہے اب تھوڑے ستارے رہ گئے

جو حقیقت سے ہے واقف، بند ہے اس کی زباں
عارفوں کی نکمد میں کچھ کچھ اشارے رہ گئے

گوہرِ نایاب نے چھوڑا نہیں آغوشِ موج
جو خزف پارے تھے دریا کے کنارے رہ گئے

کس نے عبرت اس سے لی، گو روز ہوتا ہے یہی
چل دیا انسان اور سامان سارے رہ گئے

یادِ عہدِ رفتگاں اور شاعری کا سوز و ساز
بے بسوں کے بس یہی دو اک سہارے رہ گئے

○

دل کلیسہ کعبہ و بُت خانہ ہے — امتیازِ کفر و دیں افسانہ ہے
چرخ کا خالی ہے جام واژگوں — عشق مے خانہ ہے دل پیمانہ ہے
کر رہے جس کا ستارے ہے طواف — دل مرا اس شمع کا پروانہ ہے
دل یہ کہتا ہے خرد بے سوز ہے — عقل کہتی ہے کہ دل دیوانہ ہے

نزدِ دنیا ہے حکیم اک نکتہ داں
سچ اگر پوچھو تو اک دیوانہ ہے

○

محوِ حور و قصور رہتا ہے — شیخ دنیا سے دُور رہتا ہے
مارا ابلیس کو تکبّر نے — زُہد میں بھی غرور رہتا ہے
لاکھ دنیا سے بے تعلق ہوں — کچھ تعلق ضرور رہتا ہے

ہے کہاں آفتاب وہ جس کا دیدۂ دل میں نور رہتا ہے
شاعری گو نہیں مئے گلفام
ہلکا ہلکا سرور رہتا ہے

○

گُل باغ میں اور فلک پہ تارے کس راز کے ہیں یہ سب اشارے
وہ بحرِ حیات و حُسن کیا ہے جس کے ہیں یہ دل کشا کنارے
بُلبل کو سکھایا کس نے نغمہ! کس ہاتھ نے پھول ہیں سنوارے
دل ہی نے کیا ہے اس کو تسخیر یہ شمس و قمر بھی ہیں ہمارے
مرگ اور فنا نہیں کوئی چیز
آئے تھے جہاں سے واں سدھارے

○

عشق اس عالمِ پندار کو برباد کرے کر کے ویراں اسے دنیا نئی آباد کرے
دعوتِ ہمّتِ مردانہ ہے جورِ افلاک خامئ دل ہے اگر شکوۂ بیداد کرے
تہ میں اس بحر کی ملتے ہیں بہت دُرِّ یتیم در دمیں غوطہ زنی گر دلِ ناشاد کرے
ایک بھولے ہوئے نغمے سے ہے روحوں میں خلش جیسے غربت میں کوئی اپنا وطن یاد کرے
ذوقِ تقلید تو ہے دونئ ہمت کا ثبوت
راہ اپنی دلِ زندہ کوئی ایجاد کرے

○

گلشنِ ایجاد کا ہر گُل مرے گلشن میں ہے
آسماں تاروں بھرا اک گوشۂ دامن میں ہے

چھن رہا ہے اس دلِ صد چاک سے اس کا جمال
وہ جو اک شوخ و حسیں جلوہ نما چلمن میں ہے

دل میں کروٹ لے رہی ہیں کیسی کیسی حسرتیں
کتنی بھولی بسری یادوں کا سماں ساون میں ہے

قطرۂ شبنم بھی ہے خورشید کا آئینہ دار
حُسنِ بے پایاں کی محفل ہر دلِ روشن میں ہے

عندلیبوں میں نوا ہے، آدمی میں عقل و عشق
رنگ و بُو بن کر نمایاں جو گل و سوسن میں ہے

ہے بدن یا دہر یا ذاتِ خدا تیرا مقام
اے دلِ انساں ٹھکانا تیرا کس مسکن میں ہے

○

آئیں گے خار و خس میں نظر گلستاں بہت
ذوقِ نظر سے دل جو تجھے بہرہ ور کرے

سمجھا ہے جس کو خاک، ہے یہ بھی جہانِ پاک
انساں کو حکم ہے اسے پاکیزہ تر کرے

پیغام لا رہی ہے یہ خورشید کی کرن
غنچہ بھی سینہ چاک مثالِ سحر کرے

جنت سے بھی نکل کے بنا لے ہزار خلد
انساں جو اپنی خاک کو اشکوں سے تر کرے

جس کو حریمِ ناز میں خلوت کا شوق ہو ہفت آسماں کو حلقۂ بیرونِ در کرے

لفظوں میں حُسن کاریٔ فن ہے نظر فریب
لیکن وہی ہے شعر جو دل میں اثر کرے

○

وسعتیں دہر کی سب ہیں مرے سینے کے لئے
پر نہیں اس میں جگہ کوئی بھی کینے کے لئے

فرض، قانون، خرد، سب کا مَیں ادنیٰ ہوں غلام
پر محبت ہی مجھے کافی ہے جینے کے لئے

○

خشک ہونا نہ دیدۂ پُرنم! ہیں ابھی اور داغ دھونے کے
جب سکوں روح کو نہ ہو حاصل خاک پتھر ہیں ڈھیر سونے کے

شیخ صاحب مَلک بنیں تو بنیں،
آدمی تو نہیں یہ ہونے کے

○

جواب کیا دل نشیں تھا تیرا سُنا جو مَیں نے سکوتِ شب میں
کلام کا واسطہ ہٹا کر کیا جو تجھ سے خطاب مَیں نے

حساب ہے دوستوں کا دل میں، لکھا نہیں دفترِ عمل میں
حساب کے روز سادہ پائی عمل کی اپنے کتاب میں نے

○

جو سمجھے ہیں کہ ہے تیرا اشارہ نہیں نالاں وہ جورِ آسماں سے
محبت کا حساب اپنا ہے اے دل یہ بالاتر ہے ہر سود و زیاں سے

۲

سوز و ساز

حسرتِ بے نام

گو لاکھ انسان کو دنیا میں راحت، عیش اور آرام ملے
یا ہستی کے مے خانے سے تلخابۂ غم کا جام ملے
بے لطف مشقت میں گزرے یا من بھاتا کچھ کام ملے
گمنامی میں آسودہ ہو یا شہرت پا کر نام ملے
اک درد سا دل میں رہتا ہے جو دردِ غمِ ایام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

شاہوں پہ بھی وقت وہ آتا ہے جب دولت سے بیزاری ہو
گو اُن کا سات اقلیموں میں فرمان اور سکّہ جاری ہو
جب لذّت اور غم دونوں سے انساں کی طبیعت ہاری ہو
جب رنگِ زمانہ دیکھ چکے اور یاس سی دل پر طاری ہو
ظاہر میں نہیں کچھ محرومی، کچھ رنج نہیں آلام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

گو علم و ہنر میں شہرہ ہو اور انساں کسبِ کمال کرے
کچھ عزت سے کچھ شہرت سے ہر لحظہ رفعِ ملال کرے
دنیا میں پیدا مال کرے یا فکرِ حال و قال کرے
پر دل خاموش سا رہتا ہے جب دل سے کوئی سوال کرے

جس وقت طبیعت پر طاری کوئی بھی خیال خام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

کوئی مسجد میں نمازی ہے، کوئی میدان میں غازی ہے
کام اس کا دین کی خدمت ہے یا محض اک دنیا سازی ہے
پہنچے گا حقیقت تک آخر، وہ رومی ہے یا رازی ہے
دنیا اک شیشہ بازی ہے، یہ سارا کھیل مجازی ہے

محسوس یہ روح کو ہوتا ہے یہ میری جائے قیام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

خوشبو جیسے بھینی بھینی کلیوں کی قبائے تنگ میں ہے
خوابیدہ یہ دل میں رہتی ہے جس طرح شرارہ سنگ میں ہے
گاہے یہ سکوتِ شام میں ہے گاہے یہ شفق کے رنگ میں ہے،
اور گاہے اس حسرت کی جھلک نے اور نوائے چنگ میں ہے

یہ رنگ ہے دل کی دنیا کا یہ کفر نہیں، اسلام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

پردیس میں جیسے کوئی سُنے، چھوٹے ہوئے دیس کا گیت کوئی
ساون کی پھوار میں یاد آئے بچھڑا ہوا من کا میت کوئی
حیراں سی اداسی جب کہ سماں سکھ کا جاتا ہے بیت کوئی
اس طرح کی اک میٹھی سی کسک اے من ہے تیری ریت کوئی

یہ مرغِ قفس کا نالہ ہے، یہ نغمۂ طائرِ بام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

سنسار کے دھند [illegible] ہیں کر ملتا کچھ اس کا سراغ نہیں
آفاتِ جہاں کی صرصر میں لَو دیتا من کا چراغ نہیں
ہے پردۂ دل میں اس کا اثر آگاہ کچھ اس سے دماغ نہیں
کیا اہلِ چمن کو دکھلائیں یہ لالۂ باغ کا داغ نہیں
چھپ کر رہنا ہے پسند اس کو اور ذوقِ نمودِ عام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

گہری خوشی اور گہرا غم

گھڑیاں کسی جاں گداز غم کی — گہرائیاں روح میں الم کی
لمحے کوئی دل کشا طرب کے — فیضان تھے جس میں لطفِ رب کے
دونوں میں ہے رُوح کا خزانا — اے دل نہ انھیں کہیں گنوانا!
اے یاد انھیں چھپا کے رکھنا — چپ چاپ کہیں دبا کے رکھنا
جس وقت حیات بے مزا ہو — ہستی کا چراغ بے ضیا ہو
ان لمحوں سے حُسن و نور لینا
کچھ سوز تو کچھ سرُور لینا

بحرِ حیات

یہ کائنات کیا ہے اک زندگی کا یم ہے
درد و طرب [illegible] حس [illegible] کر موجوں کا زیر و بم ہے

فتح و شکست میں بھی موجوں کی ہے روانی
یہ بھی ہے مدّو جزرِ دریائے زندگانی
خورشید و ماہ و اختر سب اس کے ہیں شناور
ہے موجِ نورانی کی تاباں ہے جس سے خاور
اس بحرِ زندگی سے اُٹھتی ہیں خوب لہریں
اس بحر کی طرف ہی بہتی ہیں ساری نہریں
دریا میں اس کی لہریں ساحل میں اس کی لہریں
ہر جاں میں اس کی لہریں ہر دل میں اس کی لہریں

من کا رُوپ

اندر مَن میں سویرا کر لے، باہر بھی ہے سویرا
مَن میں جب ہو جائے اندھیرا، باہر بھی ہے اندھیرا
باہر جو کچھ دیکھ رہا ہے مَن کی ہیں تصویریں
جو دیکھا ہے تو نے تیرے خواب کی ہیں تعبیریں
جو سنسار میں دیکھنا چاہے وہ ہی دکھائی دے گا
راگ یہاں جو سننا چاہے وہ ہی سنائی دے گا
مایا جگ میں رنگ بدل کر لیتی ہے تیرا رُوپ
اندر تیرے دھوپ اگر ہے باہر بھی ہے دھوپ
تُو میٹھا تو دنیا میٹھی، تُو کھٹّا تو کھٹّی
من میں گر آنند نہیں تو دنیا ہے اک بھٹّی

قوّتِ آرزو

نہاں ہو ایسی قوت آرزو میں
ہو خود مطلوب تیری جستجو میں
کشش کا یہ بھی ہے قانون اے دل
برس کر آئے قلزم آب جو میں

تمنائے ثمر رکھتا تھا دانہ
نکالا خاک سے اس نے خزانہ
تراش اس میں سے جو صورت تو چاہے
ہے سنگِ ناتراشیدہ زمانہ

ہے ذوقِ روح سے قالب کی تعمیر
جہاں ہے یہ تمنّاؤں کی تصویر
تمنّا میں ہے ایسی قوتِ خلق
کہ وہ خود ڈھالتی ہے اپنی تقدیر

کہیں لعل اور کہیں ہے سنگ فطرت
چڑھا لیتی ہے تیرا رنگ فطرت
نکال ایسا ترانہ سازِ دل سے
ہو تیری جاں سے ہم آہنگ فطرت

ذوق طلب

گردش میں ہیں یاں مُدام تارے
ہیں مستِ مئے خرام تارے
موجیں اوپر اُبھر رہی ہیں
گیسو کی طرح بکھر رہی ہیں
اشجار اگرچہ پا بہ گل ہیں
بے تاب مگر مثالِ دل ہیں
ہر ذرّے میں جستجو کا ہے جوش
بے نام سی آرزو کا ہے جوش

شعلے ہیں بلند کیا ہوس میں
اک آگ لگی ہے خار و خس میں
دیکھو جسے وہ رواں دواں ہے
منزل کا مگر کہیں نشاں ہے؟
اک شوق ہے بے عنانِ ہستی
مقصود ہے بس طلب کی مستی
نظریں ہیں بہت بلند اس کی
افلاک پہ ہے کمند اس کی

رفتار کا ذوق اور نمو کا
ہے زندگی نام جستجو کا

مَن کا دیا

چراغ اپنے تمنّا نے جلائے
زمانے نے وہ پھونکوں سے بجھائے
تمنّائیں بجھیں پر دل ہے روشن
چراغ لعل سے محفل ہے روشن
دیا جلتا ہے جو قلب و نظر سے
وہ ہے تابندہ تر نورِ سحر سے
نہیں پائندگی برق و شرر میں
دیا مَن کا ہے جلتا رہگذر میں
گلستاں میں چراغِ لالہ و گل
ہیں سب بادِ خزاں سے آخرش گُل
یہ دل ہے عرش کی قندیل گویا
کہ نور اس نے حوادث سے نہ کھویا
یہ نورِ جلوہ ہائے ایمنی ہے
یہ خورشیدِ ازل کی روشنی ہے

گناہوں سے ہے گو رو پوش ہوتا
چراغِ دل نہیں خاموش ہوتا

حقیقتِ گناہ

بحرِ دل میں گرچہ طوفاں خیز ہے افسوں ترا
میں حقیقت کو پہنچ کر ہو گیا ممنوں ترا

تیری ظلمت میں چھپا ہے جادۂ آبِ حیات
ہے نقابِ ابر میں مہرِ جہاں تابِ حیات

راستی کی شمع افروزی جگہ سوزی تری
ہے بصیرت آفریں کیا حکمت آموزی تری

تو نے روشن سب پہ کارِ نیک کا مضموں کیا
تیری تاریکی نے حُسنِ نور کو افزوں کیا

شعلۂ حق رزق پاتا ہے تری خاشاک سے
گلشنِ عرفاں کے پھول اُگتے ہیں تیری خاک سے

ٹھوکریں کھاتی ہوئی چلتی ہے سیلِ کوہسار
کیسے قطروں کو گہر کرتی ہے گر کر آبشار

سُرمۂ عصیاں سے اکثر تیز ہوتی ہے نظر
ٹھوکریں کھا کر بھی مسجودِ ملائک ہے بشر

اختیارِ گمرہی ہے اس کی عظمت کی دلیل
ہے یہ وہ جوہر کہ ہے محروم اس سے جبرئیل

جہنّم

ہوس کی شمع کا پروانہ ہونا
دلوں کا عشق سے بیگانہ ہونا

لطیف احساس سے محرومیِ دل
تگ و دَو حرص کی، گم کردہ منزل

بصیرت کا عدم، تنگی نظر کی
پرستاری جمالِ مال و زر کی

نہ ہمّت اور نہ مقصد کی بلندی
خور و نوش و طرب کی ہوشمندی

خودی میں کچھ تلاشِ گُل نہ ہونا
گلِ آدم کا کھل کر گُل نہ ہونا

بھڑکنا جان کا نارِ حسد سے
اندھیرا روح کا افکارِ بد سے

دلِ انساں کا بے پرواز ہونا
ربابِ جاں کا بے آواز ہونا

بنا کر وہم کے بُت اُن سے ڈرنا
ہزاروں مرتبہ بے موت مرنا

خود اپنی ذات تک محدود رہنا
دریچہ قلب کا مسدود رہنا

نہیں ہے کوئی ایندھن کا جہنّم ہے عاصی کے لئے من کا جہنّم
غلط راہوں پہ جب چلتا ہے انساں خود اپنی آگ میں جلتا ہے انساں
جہنم بھی ہے جنت بھی ہے دل میں
ہیں دونوں آدمی کے آب و گل میں

دُکھ اور سُکھ

یہ انسان کی چادرِ ہست و بود خوشی اور غم اس کے ہیں تار و پود
نہیں ایسی ممکن کوئی زندگی کہ ہو جس میں خالی خوشی ہی خوشی
تغیّر میں ہے زندگانی کا رُوپ کسی وقت بارش کسی وقت دُھوپ
کسی وقت سختی تو نرمی کبھی ہے سردی کبھی اور گرمی کبھی
یہاں غم طرب سے ہم آغوش ہے یہاں روز شب سے ہم آغوش ہے
سدا دہر میں پھرتے رہتے ہیں دن
ہے عاقل ہر اک حال میں مطمئن

انسان کی بیزاری

انسان کسی حال میں ہو شاد نہیں ہے کس لب پہ سدا نالہ و فریاد نہیں ہے
جو پائے سوا اس سے طلبگار ہے فی الفور کہتا ہے کہ یہ کم ہے مجھے چاہئے کچھ اور
زر اس کو ملے یا کہ خوشی علم و ہنر کی نقصان ہی سمجھے گا یہ عادت ہے بشر کی
زردار سے پوچھو تو وہ دولت سے نہیں سیر مفلس کو شکایت ہے کہ دنیا میں ہے اندھیر

بے زر یہ سمجھتا ہے غنی رہتے ہیں خورسند — پوچھو جو غنی سے تو نہیں اس کو کچھ آنند
یزداں سے بھی پوچھے گا کہ اس خلد میں کیا ہے؟ — حیران ہوں میری یہ سزا ہے کہ جزا ہے
اے ربِّ دو عالم مجھے دے کوئی جہاں اور — جس میں ہو فلک اور زمین اور زماں اور

جوہر ہے وہ اس میں نہیں محدود سے جو خوش — کیفیت موجودہ ہے انسان کی طرب کش
مت اس کو سمجھنا کہ یہ نقص اور بدی ہے — حق یہ ہے کہ یہ رمزِ حیاتِ ابدی ہے
قرنوں میں جو انسان ہوا خاک سے باہر — کہتا ہے نکل جاؤں اب افلاک سے باہر
جس وقت بصیرت سے کھلے عقل کے سب پیچ — عارف یہ پکار اٹھتا ہے افسوس ہے سب ہیچ

محدود وجودوں سے وہ بیزار رہے گا
بے انت حقیقت کا طلبگار رہے گا

یکجا ہوا سب تری نظر میں

کیا حُسن ہے اخترِ سحر میں — کیا رنگ ہیں پھول اور ثمر میں
نغمے بلبل کے شاخِ گُل پر — جلوہ شبنم کا برگِ تر میں
جو راز کہ دہر نے چھپایا — ہے جس کی خلش دل و جگر میں
ہے ساز کی دل گداز آواز — آہنگ ہے کیا دلِ بشر میں
تارے کرتے ہیں جو اشارے — چشمک ہے جو برق اور شرر میں

یہ حُسن یہ راز اور یہ نغمہ
یکجا ہوا سب تری نظر میں

مستی

عشق ہے جیسے اپنے حال میں مست
عقل تدبیر و قیل و قال میں مست

ہر کوئی اپنا راگ گاتا ہے
اپنے سُر اور اپنے تال میں مست

بے نوا ہے مگن فقیری میں
اور زردار اپنے مال میں مست

گرم اپنی گلیم میں درویش
ہے غنی جیسے اپنی شال میں مست

جس کو نانِ جویں نہیں حاصل
وہ ہے فردوس کے خیال میں مست

زندگی کا فریب ہے نعمت
کر دیا سب کو اپنی کھال میں مست

گرچہ ملتا نہیں جواب کوئی
اہلِ حکمت ہیں بس سوال میں مست

کچھ ہُنر کا صلہ ملے نہ ملے
ہر ہُنرمند ہے کمال میں مست

شاعرِ خوش بیاں کی مت پوچھو
بن پیے بادۂ خیال میں مست

محبّت

محبّت ہے حقیقت جاودانہ
اثر کرتا نہیں اس پہ زمانہ

محبّت ہی ہر اک مذہب کی ہے اصل
جو باقی ہے وہ افسون و فسانہ

مرا معبود ہے موجود و مشہود
مرا ایماں نہیں ہے غائبانہ

ملے ہیں چشمِ نم کو گوہرِ اشک
محبت کا یہی ہے آب و دانہ

نگاہِ عشق بن کہ دُور رس ہو
ستاروں میں ہو تیرا آشیانہ

محبّت کی خود افشانی ہے دولت
لُٹانے سے بھرے گا یہ خزانہ

سوز و گداز

اے دل نہ کر گریز تو سوز و گداز سے
واقف تجھے کرے گا یہ ہستی کے راز سے
عشرت کے سُر سے بڑھ کے ہے شیریں و دلنشیں
جو دردِ دل کا راگ نکلتا ہے ساز سے
گہری طرب بھی سوز سے ہرگز جُدا نہیں
دھوکا نہ کھائے دل کبھی اس امتیاز سے
زاہد کو اپنے زہد سے فردوس کی طلب
خواہش مجھے گداز کی بندہ نواز سے
جس کی دلِ گداختہ نے رہبری نہ کی
واقف نہیں جہاں کے نشیب و فراز سے

بخشا ہے دردِ دل نے مجھے جو حضورِ قلب
بہتر ہے زُہدِ خشک کی رسمی نماز سے

فیضانِ عشق

جذبۂ عشق چشمۂ تخلیق
روحِ خالق کی طرح ہے یہ عمیق
تھا عدم ہیچ اور بے مایہ
پڑ گیا اس پہ عشق کا سایہ
عشق نے بُن کے اپنا تار و پود
کی عطا نیست کو قبائے وجود
اس سے شمس و قمر ہوئے پیدا
اس سے جنّ و بشر ہوئے پیدا
حُسن بھی اس کی آفرینش ہے
یہ ہی دانش ہے یہ ہی بینش ہے
بحر کے موتی، چرخ کے اختر
شجرِ عشق کے ہیں سب یہ ثمر

عشق علم و ہُنر کا مصدر ہے
عشق تیغِ خودی کا جوہر ہے

عشق ہے سحر، عشق ہے اعجاز
عشق مضراب اور جہاں ہے ساز

عشق سے آفتاب میں ضو ہے
عشق سے دہر میں تگ و دَو ہے

حسن تعمیر و نغمہ و تصویر
ہے اسی آفتاب کی تنویر

اس سے رنگیں ہوئے مظاہر بھی
یہ مصور ہے اور شاعر بھی

رنگ و بُو میں ظہور کرتا ہے
ذرّے ذرّے کو طور کرتا ہے

جس کو کہتے ہیں گردشِ ایّام
وہ بھی ہے عشق ہی کا دَورِ جام

جس نے کوئی عظیم کام کیا
عشق ہی نے اُسے تمام کیا

عشق ہی ہے ہر ایک دین کی اصل
آسمانوں کی اور زمین کی اصل

جذبۂ عشق دل میں پیدا کر
روز دنیا نئی ہویدا کر

اکسیرِ محبّت

دل سرد ہے گر تو کر محبّت
آخر میں اسی سے گرم ہوگا

دل سخت ہے گر تو کر محبّت
فولاد بھی ہے تو نرم ہوگا

ہے جامِ حیات تلخ اور تیز
ہر وقت ہیں حادثے غم انگیز

اُلفت کے ملا دے اس میں قطرے
کر دیں گے یہ غم کو بھی طرب خیز

ہے عشق پرے ایک حد سے
بالا ہے بہت یہ نیک و بد سے
دے عشق کا اس کو ایک چھینٹا
جلتا ہو جو دل کوئی حسد سے

گر عشق نہ ہو حیات مہمل
ادنیٰ اعلیٰ صفات مہمل
ہر بات میں عشق سے ہیں معنی
ورنہ ہے ہر ایک بات مہمل

عشق و ہوس

ہوس ہے گلشنِ عالم میں صورتِ گلچیں
مذاق حُسن نہیں اس کو پھول سے ہے غرض
شگفتہ گل ہو سرِ شاخ تو نہیں وہ شاد
دراز دست ہے اس کو حصول سے ہے غرض

ہوس ہے لرزہ بر اندام خوف نقصاں سے
فنا کا عشق کو لیکن ذرا بھی باک نہیں
نظر سے عشق کی گوہر بنے ، خزف پارے
ہوس کے ہاتھ میں موتی بھی ہو تو خاک نہیں

ہوس سے جان ہے آلودہ اور تر دامن
نظر ہوس کی ہے ناپاک ، عشق پاکیزہ !
جہانِ عشق ہیں روحوں سے روح ہم آغوش
حریمِ عشق میں ہے ذرّہ ذرّہ دوشیزہ

لیا نہ عشق نے کچھ بھی مگر تونگر ہے
ہوس نے مال سمیٹا مگر غریب رہی
اگرچہ عشق کا ساغر تہی تھا مثلِ ہلال
وہ بڑھ کے بدر ہوا اور یہ بے نصیب رہی

مقامِ عشق

خلوتِ جاں میں بے حجاب ہے تو
حرمِ دل میں بے نقاب ہے تو

کرے خورشید جس سے کسبِ ضیا
زندگی کا وہ آفتاب ہے تو

تجھ سے ہے دہر میں ہم آہنگی
جمع اضداد کی کتاب ہے تو

تابشِ حُسنِ گوہر و شبنم
ماہ و انجم کی آب و تاب ہے تو

حُسن تیرا جواب ہو شاید
ورنہ فطرت میں لاجواب ہے تو

جس کی مستی میں کچھ خمار نہیں
خُمِ یزداں کی وہ شراب ہے تو

تہ میں ساکن ہے تو مثالِ گہر
سطح پر موجِ اضطراب ہے تو

عشق کی یک رنگی

ہیں عشق میں خیر و شر ہم آغوش
شب سے ہے یہاں سحر ہم آغوش

ہے دہر میں کوئی بد کوئی نیک
ہیں عشق کے خُم میں ڈوب کر ایک

اپنے میں سمو لیا ہے سب کو
رشتے میں پرو لیا ہے سب کو

بے عشق حرم کو دیر سے بَیر
ہو عشق تو پھر نہیں کوئی غیر

اس "میں" سے الگ جو "تو" نہیں ہے
دنیا میں کوئی عدو نہیں ہے

کرتا ہے یہ شور کو ہم آہنگ
بادل کی گرج کو نغمۂ چنگ

در مذہبِ عاشقانِ یک رنگ
سنگے بہ شرار گشتہ ہم سنگ

تربیتِ غم

بے کار نہیں ہے درد اور سوز
ہے لُطف سے بڑھ کے غم دل افروز

ہر دُکھ میں چھپا ہے ایک آنند
در کُھلتے ہیں دو جو ایک ہو بند

ہے یاس سے یاں اُمید اُگتی
اور قفل سے ہے کلید اُگتی

ہستی کی کچھ ایسی ہے بناوٹ
ہے دعوتِ فتح ہر رکاوٹ

کیچڑ میں کنول نکل رہے ہیں
مٹی کھا کھا کے پل رہے ہیں

مرگِ انجم ظہورِ خورشید
آئین جہاں کا ہے یہ جاوید

آبستنِ سُود ہے زیاں بھی
آغوشِ بہار ہے خزاں بھی

گہرائی ہے زندگی میں غم سے
انسان عمیق ہے الم سے

دورانِ حیات

بحرِ ذخّار سے بخار اُٹھا
بادپا اسپ پر سوار اُٹھا

پی کے مے جھومتا ہواؤں میں
مے کدہ کھل گیا فضاؤں میں

کسی کہسار پہ یہ جا برسا
قطرہ اس کا ہر ایک گوہر سا

کوہ سے پھر نکل پڑی ندّی
پہلے چھوٹی تو پھر بڑی ندّی

ندّیوں سے گیا یہ نہروں میں
ہُوا مستِ خرام لہروں میں

دوڑا دھرتی کی پھر رگ و پے میں
جس طرح نغمہ ہو رواں نے میں

سَیر کی خوب اس نے، خوب پھرا	آخرش اپنے یم میں جا کے گِرا

جاتی ہر شے ہے اصل کی جانب	فصل سے ہٹ کے وصل کی جانب
زندگی میں ہے ایک دَور سدا	اور دَوراں کا ہے یہ طور سدا
عشقِ قلزم میں بے سکون ہیں ہم
اس میں کیا شک کہ "راجعون" ہیں ہم

طلبِ دُنیا

دُنیا ہے حقیقت کا سایہ	اور ہر سایہ ہے بے مایہ
سائے کو تو کیسے پکڑے؟	موہوم کو تو کیسے جکڑے؟
تو اس کے پیچھے گر بھاگے	یہ بھاگے گا آگے آگے
منہ موڑ کے گر تو جائے گا	یہ پیچھے پیچھے آئے گا
دُنیا کو چاہو اکڑتی ہے	چھوڑو تو پیچھے پڑتی ہے
تو رُخ خورشید کی جانب رکھ
مہر جاوید کی جانب رکھ

درویشی

گردوں ہے زیرِ قدم ان کے رفعت ہے یہ خاک نشینوں کی
کیا دیدۂ ظاہر بیں کو خبر ویرانوں کے گنجینوں کی

ہے دوست پہ جان فدا ان کی دشمن پر چشمِ عنایت ہے
آزاد ہیں جنگِ ملل سے یہ گو روح ہیں سارے دینوں کی

کد ان کو عمرو زید سے کیا، کام ان کو رسم و قید سے کیا
اضداد سمائے ہیں اس میں وسعت ہے وہ ان کے سینوں کی

طوفانِ فنا، گرداب بلا، ہے تختِ رواں درویشوں کا
چلتے ہیں موجِ حوادث پر حاجت نہیں ان کو سفینوں کی

گنجینۂ گوہر تاروں کا، ماہ و خورشید و کاہکشاں
یہ گلشن و جو، یہ رنگ و بُو دولت ہے ان کے خزینوں کی

شبنم اور اس میں عکسِ سحر، آئینہ ہے ان کی آنکھوں کا
پانی میں عکسِ خندۂ گل آیت ہے ان کی جبینوں کی

تصویرِ شریعت ہے اس میں، تمثالِ حقیقت ہے اس میں
سب حُسن ودیعت ہے اس میں، ایسی ہے جلا آئینوں کی

طوفاں میں گُہر کو ڈھونڈتے ہیں، پتھر میں شرر کو ڈھونڈتے ہیں
عیبوں میں ہُنر کو ڈھونڈتے ہیں، عادت ہے یہ ان خوش بینوں کی

چشمِ ظاہر سے حجاب ان کا چہرہ ہے زیرِ نقاب ان کا
فردوسِ نظر ہے شباب ان کا، صورت دیکھ ایسے حسینوں کی

جوگی کا گیت

آج تو سارے پیڑ ہرے ہیں، تازہ پھول اور پات

ٹہنیاں پھول اور پھل سے جھکی ہیں، ہر شے کی بہتات
اِک دن ایسا بھی آئے گا کچھ نہ رہے گا ہات
سُن لے میری بات رے بابا سُن لے میری بات

ہر شے یہاں پہ آنی جانی ہر شے فانی ہے
کل مچھلی پھر ریت میں تڑپے آج تو پانی ہے
دُکھ تو اس سنسار کی پیارے ریت پُرانی ہے
دو دن ہے یہ چاند کی لیلا پھر ہے اندھیری رات

سارے رُوپ سروپ ہیں مایا، مایا رنگ اور راگ
موہ میں پھنسنا نرک میں دھنسنا موہ سے کوسوں بھاگ
یاں پہ لگاؤ خوب نہیں ہے اور نہ اچھی لاگ
جیت میں بھی یاں ہار ہے بابا، مات ہے بازی مات

پھنسی اَسَتّ میں ساری پرجا دھوکوں کا ہے راج
دوڑ دھوپ ہے لوبھ کی ساری، کپٹ کا کام اور کاج
جو اَن داتا بنتے تھے ہیں روٹی کے محتاج
ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے مایا، باقی ہے اک ذات

بڑھاپے کی عقل

باگیں تھامنا آیا ہم کو، گھوڑے جب مردار ہوئے
اب جذبات کو روکنا کیسا خود ہی وہ بیکار ہوئے

آنکھیں جب بے نُور ہوئیں تو عقل چراغ دکھاتی ہے
اب جب دل میں کچھ نہ رہا تو دل کے داغ دکھاتی ہے

گہری نیند رہے ہم سوتے، رہزن لُوٹ کے بھاگ گئے
جب بستر بھی رہا نہ باقی، ہلکے ہو کر جاگ گئے

اب پرہیز کو فخر ہے اس پر، ہم نے گنہ کو چھوڑ دیا
تو نے چھوڑا کیا ہے گنہ کو، خود اُس نے منہ موڑ لیا

تن اور من میں کچھ نہ رہا اب چاٹیں کیا تدبیروں کو
سانپ نکل کر بھاگ گیا بیکار نہ پیٹ لکیروں کو

رن میں جب کوئی نہیں باقی چمکائیں تلواریں کیا
نفس تھا دشمن خود ہے مُردہ اب مُردے کو ماریں کیا

مُردوں کے سر کاٹ کے عقل اب غازی بن کر بیٹھی ہے
دین سکھانے کو رومی اور رازی بن کر بیٹھی ہے

جب کھاتا تھا شباب تھپیڑے عقل کہاں انسان میں تھی
تب ملّاح کہاں سوتا تھا، کشتی جب طوفان میں تھی

ساغر ہی جب ٹوٹ گیا تب پینے کا ڈھب آیا ہے
جینا ہاتھ سے چھوٹ گیا تب جینے کا ڈھب آیا ہے

اب کس خوبی سے ہے بتاتی، کیا ہے نیک اور کیا ہے بد
سچ تو یہ ہے پیری میں ہے "مشتے بعد از جنگ" خرد

بڑھاپا آیا

ہے نجمِ سحر، چراغِ ہستی جلتا ہے پہ ٹمٹما رہا ہے
بیگانہ ہوئے قویٰ بھی اپنے کوئی نہیں آشنا رہا ہے
آمدِ زدِ اجل کہ در کھلے ہیں سامان ہی گھر میں کیا رہا ہے
بھونچال سا آگیا بدن میں بنیاد کو بھی ہلا رہا ہے
باقی ہے خمار ہی کا عالم ہر نشے کا لطف جا رہا ہے
محفل ہوئی ختم، شمع گُل ہے فراش بساط اُٹھا رہا ہے
پتّا نہیں ایک بھی اب اس پر جو نخل ہرا بھرا رہا ہے
اس چیز سے اب نہیں کوئی ربط جس چیز پہ دل فدا رہا ہے
ڈھونڈیں کوئی اور جا کے دنیا اس زیست میں کیا مزا رہا ہے
سُنتے ہو کہ کان ہو گئے بند
دیکھو کوئی بُلا رہا ہے!!

جوانی گئی

کہاں چھوڑ مجھ کو جوانی گئی گئی رونقِ زندگانی گئی!
ہر اک چیز ہے آنی جانی یہاں جوانی بھی تھی آنی جانی، گئی
لہو تھا شراب، اب وہ پانی ہُوا لہو کو مرے کر کے پانی، گئی
وہ دھوکوں کی موجد، وہ ابلہ فریب وہ عشق و محبّت کی بانی، گئی

حسینوں سے اب وہ کشاکش نہیں ‏ رقیبوں سے اب بدگمانی گئی
سمجھاتی تھی مضموں، تو کہتے تھے شعر ‏ وہ شاعر کی جادو بیانی گئی
بنی سیلِ کہسار، جو تھے چمن ‏ وہ تیزی گئی اور روانی گئی
ہیں اب ایک تختے پہ بے بادباں ‏ جو چلتی تھی کشتی دُخانی، گئی
گئے دن کہ جب مست تھے بن پیے ‏ کہاں بے سبب شادمانی گئی
ہیں بدلے ہوئے آشناؤں کے طور ‏ کہاں. وہ محبّت پُرانی گئی
وہ فطرت پہ ہے اب حکومت کہاں ‏ گئی، ہاتھ سے راجدھانی گئی
یکایک بدل کر برہ گن کا بھیس ‏ کسی بَن کی جانب وہ رانی گئی
بہت کی خوشامد ٹھہر جا ذرا ‏ مگر بات کوئی نہ مانی گئی
بُلانا نہ مجھ کو، نہ آؤں گی مَیں ‏ یہ پیغام دے کر زبانی گئی

وہ رفتار تھی، ہم ہیں نقشِ قدم
یہی چھوڑ کر وہ نشانی گئی

دُنیا دار

ہے تیری اُمید خاک آلود ‏ جس طرح کہ نقشِ پا کا آغوش
دھوکوں میں ہی دوڑ دھوپ تیری ‏ اور مقصدِ اصل ہے فراموش
ہنگامۂ جاہ و طلبِ زر میں ‏ ہے سازِ لطیف دل کا خاموش
محروم نوائے راز سے ہے ‏ کیوں قلب ہوا ترا گراں گوش
دنیا طلبی ہے اک کثافت ‏ انساں ہے وہی جو ہے صفا کوش

بارِ غمِ روزگار سے خم
دل تیرا نہ ہو سکا سبکدوش
سینہ تاریک صورتِ گور
جس طرح جہاں پہ شب کا سرپوش
ابلیس کا ہم نشیں ہوا ہے
ہونا تھا ملائکہ کا ہم دوش
ہوتی ہے بس اس سے جھاگ پیدا
تیرے جذبات میں جو ہے جوش
حیوان میں اور تجھ میں کیا فرق
مقصد ہے اگر یہی خور و نوش
انساں کا شرف ہے دل سے، ورنہ
ہاتھی کا گراں ہے کیا تن و توش

میرا بدن

کسی پر نہ یہ راز اب تک کھُلا
بدن اور جاں کا تعلق ہے کیا
بدن روح کی اپنی تعمیر ہے
کہ آزاد جانوں کی زنجیر ہے
عدو ہے کہ تو یار ہے اے بدن
کبھی رہنما ہے کبھی راہزن
یہ جاں ایک لَے ہے ترے ساز کی
کہ تو بازگشت اس کی آواز کی
اگر جاں ہے معنیٰ تو صورت ہے تو
لطافت کے ساتھ اک کدورت ہے تو
کہیں حُسن ہے تجھ میں صورت پذیر
کہیں تو ہے زنجیرِ جانِ اسیر
کہاں تک ترا ساتھ دیں اے بدن
اُترنا ہی آخر ہے یہ پیرہن
ترے پیار میں کج ادائی بھی ہے
محبّت بھی ہے اور لڑائی بھی ہے
ترے ساتھ وابستہ ہیں خیر و شر
تو بگڑے تو دنیا ہے زیر و زبر
اگر تیری حالت ہو خوار و زبوں
تو ہو نیکیوں اور ارادوں کا خوں

ترے آئینے پہ ہو گرد و غبار! تو دھندلے ہوں ہستی کے نقش و نگار
اگر تار ڈھیلے ہوں اس ساز کے کریں بات کیا نغمہ پرداز کے
گر چسپت ہوں اس کے تار اور پوست تو آتی ہے پھر اس میں آوازِ دوست

بگاڑا جو راہب نے تیرا نظام لیا روح سے تو نے کیا انتقام
ہے غارت گرِ جاں تری رہزنی بڑی روح فرسا تری دشمنی
رکاوٹ بھی ہے اور تدبیر بھی تو زیور بھی ہے اور زنجیر بھی

جو شیطان نے آدم کا دیکھا بدن تو تحقیر سے وہ ہوا خندہ زن
نظر آیا اک پیکرِ آب و گل کہاں اس میں جاں اور کہاں اس میں دل
ہے ظاہر میں تو ایک خاکی وجود کہ ناچیز سی جس کی بود و نمود

یہ سب لے بدن تیری تلبیس ہے
فرشتہ جو تھا اب وہ ابلیس ہے

اپنے آپ سے ملاقات

مدّت سے کر رہا تھا جناب آپ کی تلاش تھی شہر یا کہ دشت میں حضرت کی بود و باش
سب سے میں پوچھتا تھا کہ حضرت کہاں گئے ہے کوئی جس کو دے کے پتا اور نشاں گئے
تشویش تھی یہ دل میں کہ کھوئے گئے کہیں افلاک پر گئے کہ انھیں کھا گئی زمیں
شاید دیارِ غیر میں محبوس ہو گئے سب ملنے والے آپ کے مایوس ہو گئے

دل سے مٹا تھا آپ کا ہر اک خیال بھی
دھندلے پڑے تھے ذہن میں سب خط و خال بھی

بتلاؤ ہر زہ گردِ جہاں میں کہاں پھرے
کس کی تلاش میں صفتِ آسماں پھرے

پھرتے رہے ہیں آپ ہوس میں کہاں کہاں
چھانی ہے خاک تیس برس میں کہاں کہاں

غوطہ لگا کے بحر میں گوہر کوئی ملا؟
کی تھی فلک کی سیر تو اختر کوئی ملا؟

کھوئے رہے تھے یوں ہی کہ پایا کچھ آپ نے
سب کچھ گنوا دیا کہ کمایا کچھ آپ نے؟

ہے یہ خوشی کہ ہمدمِ دیرینہ مل گیا
گویا کہ یک بیک کوئی گنجینہ مل گیا

مجھ کو نہ تھی حرم کی نہ تھی دیر کی تلاش
مجھ کو تھی اپنی روحِ فلک سیر کی تلاش

اپنے سے گر ملا نہیں، دُنیا میں کیا لیا
سب کچھ ملا جو آپ نے اپنے کو پا لیا

اپنی اپنی دُنیا

ہر اک روح کی ہے الگ کائنات
الگ ہے ہر اک جان کا رازِ حیات

کسی روح میں کوئی در ہی نہیں
کوئی اس میں رخنہ نہیں ہے کہیں

ہر انسان ہے اک جزیرہ الگ
ہر اک روح کا ہے وطیرہ الگ

پھر اس پہ یہ فطرت کا اعجاز ہے
کہ انسان انساں کا ہمراز ہے

ہیں روحیں الگ روح پرور ہے ایک
جزیرے الگ ہیں سمندر ہے ایک

اے دل اے دل واپس آ!!

رُخ سورج نے پھیرا ہے
باہر سخت اندھیرا ہے
تاریکی نے گھیرا ہے
رات سے دُور سویرا ہے

اے دل اے دل واپس آ!

راہ میں ڈسنے والے ہیں
بچھو ہیں اور کالے ہیں
پاؤں میں تیرے چھالے ہیں
موت نے ڈورے ڈالے ہیں

اے دل اے دل واپس آ!

اب یہ ہرزہ گردی چھوڑ
گھر کی جانب باگیں موڑ
اپنے آپ سے رشتہ جوڑ
باقی سب زنجیریں توڑ

اے دل اے دل واپس آ!

باہر کیا کرتا ہے طلب
کیوں پھرتا ہے روز و شب
تو ہے ناداں ہائے غضب
تیرے ہی اندر ہے سب

اے دل اے دل واپس آ!

گھر

پرکار کی ہے فطرت بشر میں
اک پاؤں گرداں اک پاؤں گھر میں
رشتہ ہے جیسے آنکھ اور نظر میں
وابستہ گھر سے ہے وہ سفر میں

چکّر لگانے ساری زمیں پر | نن تھا مسافر دل تھا یہیں پر
یہ سُکھ نہ پایا ہم نے کہیں پر | کیوں رشک آئے خلدِ بریں پر

دریا ہے ہستی تیز اس کا دھارا | طوفانِ غم ہیں ہے وہ کنارا
ملجا و ماویٰ ، دل کا سہارا | جنت زمیں پر ہے گھر ہمارا

کاشانہ ہو یا تعمیرِ خشتی | اس میں نہیں ہے دنیا کی زشتی
ہے نوح کی یہ طوفاں میں کشتی | اس کی فضا ہے کیسی بہشتی

پیکارِ ہستی کیسی زبوں ہے | خوں ریز جنگِ عقل و جنوں ہے
گھر سے پرے پر دنیائے دوں ہے | باہر فساد اور اندر سکوں ہے

بد دعا

پرورش دہر میں ہو ناز و نعم میں تیری
ایک ساعت نہ بسر ہو کبھی غم میں تیری

راہِ ایمن ہو تری، ہر خطر و بیم سے دُور
تو رہے کشمکشِ دہر کی تعلیم سے دُور

رہے محفوظ سدا سوز و گدازِ دل سے
سُر طرب ہی کے نکلتے رہیں سازِ دل سے

نہ ہو معلوم تجھے دردِ جگر ہے کیا چیز ؟
نالۂ نیم شبی ، آہِ سحر ہے کیا چیز

کسی مقصد میں تگ و دَو کی ضرورت نہ رہے
ورزشِ نفس و بدن کی کوئی صورت نہ رہے

طلبِ علم کے اور کسب و ہنر کے دھندے
نہ پڑیں تیرے گلو میں کبھی ایسے پھندے

رُعب حاصل ہو جہاں میں تجھے سرمائے سے
دُور ہوں نکبت و افلاس ترے سائے سے

بادِ خواہش ہی سے اُمید کے غنچے کِھل جائیں
تجھ کو آسانی سے مَن مانی مرادیں مل جائیں

دست بستہ تری خدمت میں ہوں انسان کھڑے
جس طرح بُت ہوں صنم خانے میں بے جان کھڑے

پُتلیوں کی طرح خلقت ترے تاروں پہ چلے
اور سدا گردشِ ایّام اشاروں پہ چلے

تجھ کو جس چیز کی خواہش ہو میسّر ہو جائے
تیرے ہاتھوں میں خزف پارہ بھی گوہر ہو جائے

دین و دنیا میں تجھے فکر کی کاوش نہ رہے
اور بن پورے ہوئے کوئی بھی خواہش نہ رہے

سارے محتاج کریں روز خوشامد تیری
اور انھیں قبلہ امید ہو مسند تیری

خوفِ نقصاں سے کبھی سچ نہ سنائیں تجھ کو
اور کبھی تیری حقیقت نہ بتائیں تجھ کو

زندگی کیا ہے کسی طرح کا گر غم ہی نہیں
اس سے بڑھ کر کوئی دنیا میں جہنم ہی نہیں
کشمکش دہر کی ہے فطرتِ انساں کی غذا
خس و خاشاک ہیں سب شعلۂ عریاں کی غذا
موت دل کی ہے یقینی طرب اندوزی سے
روح کو خلد میسّر ہے جگر سوزی سے
خاک ہو جاتا ہے انسان تن آسانی سے
لذتیں روح کی وابستہ ہیں قربانی سے
جہدِ پیہم ہے یہاں اوج و بقا کی قیمت
غوطہ طوفاں میں دُرِ بیش بہا کی قیمت

شیخ اور صُوفی

شیخ و صُوفی کا فرق ظاہر ہے — ایک عاشق ہے ایک مزدور
ایک دیدارِ یار میں ہے مست — ایک کو جاں فزا ہے وعدۂ حور
ایک کا ہے خُدا دلوں سے قریب — ایک کا ہفت آسماں سے دُور
شیخ کا ہے خدا بڑا قہّار — اور صوفی کا ہے رحیم و غفور

ایک اپنی نجات کا خواہاں — ایک کو سب کی مغفرت منظور
ایک میں غصہ ایک میں ہے پیار — ایک میں نار ایک میں ہے نور
ایک نیکی کا اس لیے خواہاں — ہو کسی طرح خلد میں ماجور
ایک حسنِ عمل کا دلدادہ — کہ طبیعت ہو نور سے معمور
ایک ناظر ہے یاں قیامت کا — ایک کو انتظار روزِ نشور
ایک مر کر جہانِ نو میں گیا — جیتے جی کر گیا ہے ایک عبور

چشمِ باطن میں بے نقاب ہے وہ
چشمِ ظاہر سے جو رہا مستور

زندگی

شمس میں تُو قمر میں تُو، سنگ میں تُو شجر میں تُو
مظہرِ جلوہ زا میں تُو، نور میں تُو نظر میں تُو

حسن میں تیرا ساز ہے، عشق میں تیرا سوز ہے
اس میں ہے دل گداز تو، اس میں نظر فروز ہے

عقل میں تیری سردیاں، عشق میں تیری گرمیاں
خار میں تیری تیزیاں، گُل میں ہیں تیری نرمیاں

ذوق ہے کیا نمود کا، شوق ہے کیا شہود کا
جلوۂ نو بہ نو ہے فن، کارگہِ وجود کا؟

موت کا خوف ہر جگہ یہ بھی ترا فریب ہے
تیری سرشت ہے بقا اور فنا فریب ہے

کہتے ہیں جس کو وقت ہے زاویۂ نظر ترا
میرا احاطۂ مکاں نقش ترا اثر ترا

تیری روش میں اے حیات کیا یہ تضادِ ذوق ہے
شیشہ گری کی ہے دکاں، سنگ زنی کا شوق ہے

عنصرِ لازمِ حیات صلح بھی ہے ستیز بھی!
خندۂ گل کے ساتھ ہے شبنم اشک ریز بھی

وحدتِ زندگی ہے اصل، کثرتِ جلوہ سرسری
تیرا عدو کوئی نہیں دہر ہے جنگِ زرگری

گوہرِ فردِ فردیاں وحدتِ حق میں سفتہ ہے
سبحۂ دانہ دانہ میں رشتۂ جاں نہفتہ ہے

تو نہ سمجھ کہ ہے یہاں تجھ کو بقا قیام سے
رونقِ میکدہ ہے سب گردش و دورِ جام سے

کشمکشِ حیات میں تجھ کو ملے سکوں کہاں
موجِ طپیدہ کی طرح ساحلِ بحر ہے رواں

ٹھہر گئی ہے اک جگہ آنکھ جو دور بیں نہیں
جادۂ جاں ہے ہر طرف منزلِ جاں کہیں نہیں

چشمِ بصیر گر تری ذوق سے کامیاب ہے
قطرے میں بحر موجزن، ذرّے میں آفتاب ہے

اہلِ نظر کو اک نظر روکشِ جبہ نیل ہے
صاحبِ دل کو زندگی کوثر و سلسبیل ہے

کرتا ہوں سیرِ زندگی ذوق کی اک نظر لیے
گلشنِ کن فکاں کے پھول دامنِ دل میں بھر لیے

دن اور رات

دن ہے میاں اور بیوی رات — دیوتا یہ اور دیوی رات
بیٹیاں ان کی دو گلفام — ایک سحر ہے ایک ہے شام

دن کا چہرہ ہے خورشید — نورِ بصر ہے جس کی دید
رات کا چہرہ ہے مہتاب — خوب ہے جس کی آب و تاب

دن کو ہے روزی کی فکر — شب کو دل افروزی کی فکر
رات کی تو ہر بات ہے شعر — دن ہے نثر اور رات ہے شعر

زندگی اور وقت

صدی پہ بھاری ہے اک ساعت — یہ اعجاز بھی ہے ممکن
دل تخلیق سے ہے زندہ — کام ہے ہستی کا ضامن
وقت ہے دولتِ بیش بہا — انساں ہے اس کا خازن
کرے حفاظت تو ہے امیں — اور گنوا دے تو خائن
جینا ان کا جینا ہے — جو انسان کے ہیں محسن

اس جینے سے موت اچھی جس کو دیکھ کے آئے گھن

جس کا وقت ابد پیوند
کہتے ہیں اُس کو مومن

خود کُشی

جینے کا نہیں جو کوئی مقصود اس بود سے تو بھلی ہے نابود
پوچھے کوئی بے خرد بشر سے مقصود بھی کچھ ہے زر و زر سے
پیوستہ ہے روزگار کی فکر مل جائیں جو سو ہزار کی فکر
زندہ رہنا فقط ہے منظور بیہودہ سی سعی پر ہے مجبور
گر زر میں نہیں تری بھلائی مٹی ہے وہ سب تری کمائی

ایسے جینے میں کیا خوشی ہے
جینا کیا ہے وہ خود کشی ہے

ساقی نامہ

پلا ساقیا آج ایسی شراب کہ ساغر ہیں جس کے مہ و آفتاب
وہ مے جس سے قائم جہاں کا شباب زمیں کا شباب آسماں کا شباب
جو مایوس دل سے مٹاتی ہے یاس بجھاتی ہے جو تشنہ روحوں کی پیاس
نہیں جس سے رہتا غمِ بیش و کم طرب کو ہے کرتی ہم آغوشِ غم
وہ مستی کا چشمہ وہ نادر شراب کہ لہریں ہیں جس کی ہیں چنگ و رباب

وہ مے جو گدا کو شہنشہ کرے
خودی کھو کے مجھ کو خود آگہہ کرے

کہ ہو جائے جب روح سرشار و مست
کرائے اُسے یاد عہدِ اَلَست

مٹا دے دلوں سے جو بغض و حسد
نہ باقی رہے کچھ من و تو کی حد

جو دوڑے رگوں میں یہ سیّال آگ
سمجھنے لگوں میں پرندوں کا راگ

ہے بلبل کی کیا گل سے گفت و شنید
یہ شاہد ہے کیوں اور کیوں وہ شہید

سمندر کی لہروں میں بہتا پھروں
جو فطرت چھپائے وہ کہتا پھروں

ستاروں میں چمکوں چمن میں کھِلوں
زمانے کے بچھڑے ہوؤں سے ملوں

جو آجائے اس مے کے پینے کا ڈھنگ
سمجھ جاؤں مر کر بھی جینے کا ڈھنگ

۳

خاک و افلاک

کس نے کہا پست ہے تری خاک
اس خاک پہ سر نگوں ہیں افلاک

حکیم

بقا

سمجھتا ہے چیز آنی جانی ہوں مَیں
بقا اعتباری ہے فانی ہوں مَیں

یہ ہستی تری نو رسیدہ نہیں
یہ روحِ ازل، آفریدہ نہیں

جہاں سے ہے ابھری تری جاں کی لہر
ازل سے چلی آرہی ہے وہ نہر

جو تھا شوقِ پرواز ذرّات میں
وہ ذوقِ نمو ہے نباتات میں

وہ قرنوں کی سعیٔ نبات و جماد
نہیں اب کوئی جس کا انداز یاد

ہوئے مرتکز تجھ میں سب ممکنات
ہیں سب تجھ میں اے وارثِ کائنات

زمانے میں جو کچھ فنا ہو گیا
وہ تجھ تک پہنچ کر بقا ہو گیا

وراثت ازل کی بقا ہے یہی
یہی ہے حیات، ارتقا ہے یہی

کوئی چیز بھی دہر کھوتا نہیں
فنا کوئی ذرّہ بھی ہوتا نہیں

ستارہ جو ٹوٹا تھا افلاک سے
وہ گُل بن کے نکلا ہے اب خاک سے

گزشتہ بہاریں ہیں ہر پھول میں
ہیں سب علّتیں ایک معلول میں

سرودِ گزشتہ ہے ہر تان میں
زمانے چھپے ہیں ہر اک آن میں

ہر اک فرد ہے کائناتِ صغیر
ہر اک ذرّہ ہے روحِ مہر منیر

وراثت ہے میرا ہُنر شعر میں
ہزاروں سخن ور ہیں ہر شعر میں

خاک

کس نے کہا پست ہے تری خاک — اس خاک پہ سرنگوں ہیں افلاک
یہ خاک ہے جاں گُل و ثمر کی — ہر ذرّہ ہے اس کا گوہرِ پاک
اس نے ہی جھکا دیے ملائک — جب علم سے ہو گئی یہ چالاک
پیدا ہوں ہزار اس سے خورشید — کردے یہ اگر کبھی جگر چاک
سینے میں ہے اس کے آتشِ عشق — ہیں بحر سب اس کی چشمِ نمناک
اس میں ہے غذا، دوا، شفا سب — اکسیر یہی، یہی ہے تریاک
معراج ہے قدسیوں کی اس پہ — اس پہ ہی رہا وہ شاہِ لولاک
ہے نورِ شعور اس سے پیدا — مٹی کا دیا چراغِ ادراک

جس کو تو سمجھ رہا ہے فردوس
ہے خواب اسی کا اک طربناک

تقدیرِ آدم

خدا نے مقدر کیا ہے یہی بس — جو چاہے بنا لے وہ تقدیر اپنی
ہیں شمس و قمر اور تارے مسخر — زمیں سے فلک تک ہے تسخیر اپنی
نہ ہو آنکھ میری تو سوچ میں کیا ہے — نظر کو ملی اس میں تنویر اپنی
نکالا تھا جنت سے اپنے کو میں نے — جہانوں میں کرتا ہوں تشہیر اپنی
مقدر کا کہتا ہوں جس کو نوشتہ — وہ لوحِ ازل پہ ہے تحریر اپنی

قوانین و آئین شکنجے ہیں میرے — پہنتا ہوں خود آپ زنجیر اپنی
مرا دل ہے فطرت کا اصلی صحیفہ — لکھی بحر و بر میں ہے تفسیر اپنی

کہے گر کوئی، خواب ہے زندگانی
ہے اپنا ہی خواب اور تعبیر اپنی

وارثِ حیات

تھیں جس تڑپ کی لہریں ذرّاتِ اولیں میں — وہ ہو گئی نمایاں آ کر مری جبیں میں
دَوڑا جو میری رگ میں، اس خون کے عناصر — تھے ضَو فگن کسی کے رخسارِ نازنیں میں
میرے بدن کا ہر اک ریشہ ہے اس کا وارث — جو حُسن جلوہ گر تھا اب تک کسی حسیں میں
قرنوں رہا وہ روحِ فطرت میں بن کے ارماں — جس درد کی کسک ہے میرے دلِ حزیں میں
اُبھرا وہ کچھ چمن میں، کچھ آدمی کے من میں — فطرت نے جو خزانہ پنہاں کیا زمیں میں
میری نگاہ میں ہے سارا فشارِ انجم — جس طرح رس ہے سارے پھولوں کا انگبیں میں
سُورج نے گھر بنایا لعلِ یمن کے اندر — طوفانِ بحر پنہاں، موتی سے نازنیں میں
شبنم کا ایک قطرہ جامِ جہاں نما ہے — کون و مکاں کا مرکز ہے چشمِ نکتہ بیں میں
پہنائے آسماں کے تاروں میں تھے درخشاں — اُڑتے ہیں جو شرارے اب آہِ آتشیں میں
انگشتری ہے دہر اور دل اس میں اک نگیں ہے — اور نامِ جانِ جاں کا کندہ ہے اس نگیں میں

مَیں کائنات میں ہوں اور کائنات مجھ میں
ہے دہر میرے اندر، مَیں دہر آفریں میں

باقی

سیاہی سے تر ہے مقدّر کا خامہ
ابھی لوح پہ کچھ ہے تحریر باقی

کرے گی وہ پتھر سے انساں تراشی
ابھی ہے بہت کارِ تقدیر باقی

ابھی تو ہے دیوار تا قدِّ آدم
ہے ساری فلک بوس تعمیر باقی

تعمیرِ تقدیر

ثمر تخمِ عمل کا ہے یقینی
مگر فطرت بہت عاجل نہیں ہے

بنا لے آتشِ گلخن کو گلشن
کچھ ابراہیم کو مشکل نہیں ہے

دلوں کے ساز سے نغمے ہیں پیدا
یہ چنگ و عود کی محفل نہیں ہے

کبھی دل کو نہیں ملتی وہ دولت
جگر کاوی کا جو حاصل نہیں ہے

نہیں مطلوب تک تیری رسائی
تو تیری آرزو کامل نہیں ہے

انساں بھی ہے اک طرح کا خالق

تو جس کو سمجھ رہا ہے ہستی
یہ چیز نہیں بنی بنائی

ہے کام ابھی بہت سا باقی
کر تو بھی تو زور آزمائی

مانا ہے خدا کا کام تکوین
ہے تو بھی تو مظہرِ خدائی

دنیا میں کثافتیں ہیں باقی — ہے تیرے سپرد یہ صفائی
ہے تیرے ہی امتحاں کی خاطر — گردوں کی تمام فتنہ زائی
ہے شوق پہ اور تازیانہ — حالاتِ جہاں کی کج ادائی
نالہ ہے حرام مرغِ جاں پہ — اس کا تو ہے کام نغمہ زائی
ہر ذرّہ کھنچے گا تیری جانب — ہے عشق میں ایسی کہربائی
ظاہر میں ہے یاں ستیزہ کاری — باطن میں ہے رنگِ آشنائی
لاہوت بھی تجھ سے ہے ہم آہنگ — جبریل کی تجھ سے ہم نوائی
کر اپنی وفا کو اور مضبوط — دنیا میں اگر ہے بے وفائی
فطرت سے ہو کس لیے تو عاجز — تجھ میں ہیں صفاتِ کبریائی

انسان بھی ہے اک طرح کا خالق
حق ہے یہ نہیں ہے خود ستائی

سنگ تراش

مَیں سنگِ گراں ہوں نہ کر پاش پاش — مجھے چھیل کر دیوتا اک تراش
ہے تخلیقِ سیرت بڑی درد خیز! — جگر دوز ہے کوششوں کی خراش
اسی سنگ میں میری تصویر ہے — کرو مجھ کو پردہ ہٹا کر تلاش

مجھی میں چھُپے ہیں مرے ممکنات
مرے راز کر میری صورت میں فاش

جستجو

کہیں آغوشِ طوفاں میں گُہر ہے
زمیں کی انتڑیوں میں کانِ زر ہے

چھپی پانی کے دھارے میں ہے بجلی
کہیں پتھر کے پردے میں شرر ہے

حجابوں میں چھپا ہے حُسنِ فطرت
فقط ہمّت یہاں پر پردہ در ہے

یہاں بے جستجو ملتا نہیں کچھ
یہی اندازِ تقدیرِ بشر ہے

نکلتا ہے فقط جہدِ نمو سے
چھُپا چھوٹے سے دانے میں شجر ہے

پرے افلاک سے یا دل کی جانب
بڑھے جا زندگی ذوقِ سفر ہے

زندہ شہید

نگاہوں میں ہے کوئی مقصد بلند
ہے سینے کے اندر دلِ دردمند

وہ اپنے مقاصد سے پھرتا نہیں
زمانہ گرائے تو گرتا نہیں

سمجھتا ہے دنیا کو میدانِ جنگ
فرار اس سے ہے موجبِ عار و ننگ

کبھی ڈگمگائیں نہ اس کے قدم
نہ شوقِ ستائش نہ پروائے ذم

اگر تختۂ مشقِ آلام ہے
سمجھتا ہے نیکی خود انعام ہے

نہ شکوہ ہے لب پر نہ فریاد ہے
وہ زنداں میں بھی ہے تو آزاد ہے

ہے کام اس کا ذاتی غرض سے بَری
طبیعت خودی کے مرض سے بَری

لگاتا ہے دنیا میں ایسے شجر
نہ کھائے گا خود جن کے ہرگز ثمر

سدا ساغرِ تلخ پیتا ہے وہ
مسلسل شہادت میں جیتا ہے وہ

مصیبت میں ہے شوق اس کا مزید
یہی ہے حقیقت میں مردِ شہید

بہت سہل ہے جنگ تلوار کی
ہے دشوار پیکار ایثار کی

کیا جس نے یوں زندہ رہ کر جہاد
کہا مرگ نے بھی اُسے زندہ باد

انسانِ کامل

کہاں ہے وہ انسان خجستہ سرشت
کہ ہو جس کے سینے کے اندر بہشت

حق آگاہ و آزاد و بے باک ہو
دل اس کا غم و حزن سے پاک ہو

نہ کھائے غلط آرزو سے فریب
نہ ہو کھوٹے سکّوں سے پُر اس کی جیب

محبّت کو جس نے بنایا ہو دیں
ہُنر جُو ہو اور جو نہ ہو عیب چیں

تونگر قناعت کی دولت سے ہو
غنی اپنے رنگِ طبیعت سے ہو

جو ہو لذت اندوز توحید سے
گریزاں ہو کورانہ تقلید سے

خوشامد سے ہرگز اُبھرتا نہ ہو
مذمّت سے دنیا کی ڈرتا نہ ہو

امیروں کے آگے جو جُھکتا نہ ہو
جو سچ بات کہنے سے رُکتا نہ ہو

اگر ایسا انسانِ کامل ملے
تو انسانیت کو بھی منزل ملے

تقلید

پیروی میں ہے دونیٔ ہمّت
راہِ تقلید، جادۂ خواری

ہے مقلّد کی نیکیوں سے بھلی — مردِ آزاد کی غلط کاری
قلب کی خستگی سے ہے تقلید — حُرّیت میں ہے دل کی بیداری
فطرتِ پست کے لیے ہے حکم — رسم و آئین کی گرفتاری
رشتہ بر پائے دل ہے رسم پرست
رشتہ بر دوش جیسے زُنّاری

یکتائی

جتنے ہیں فرد اتنے مقاصد ہیں دہر میں — ہر اک کی زندگی کا ہے یاں مُدعا الگ
دشواریوں کو ایک کی سمجھے نہ دوسرا — مشکل جُدا ہر ایک ہے مشکل کشا الگ
کس نے کہا جہان ہمارا ہے مشترک — ہر لحظہ ہیں ہر ایک کے ارض و سما الگ
تدبیر سب کی اور ہے تقدیر سب کی اور — ہر ایک جاں کے واسطے حکمِ قضا الگ
نسرین و نسترن ہے جدا، یاسمن جُدا — ہر پھول کو کھلاتی ہے بادِ صبا الگ
پھرتا ہر اک ستارہ ہے اپنے مدار میں — ہر ایک کا مزاج جدا اور ضیا الگ
کپڑا ترا سجے نہ کبھی جسمِ غیر پر — فطرت نے بھی بنائی ہر اک کی قبا الگ
"تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی"
اے طالبِ کمال کر اپنی ہی پیروی

موت

اے جانِ جاں اے روحِ زماں — تو مرنے سے کیوں ڈرتا ہے

زندہ ہے تو مر سکتا ہی نہیں جو مُردہ ہے وہی مرتا ہے
دانے میں جوشِ نمو ہے گر وہ بن کر پیڑ اُبھرتا ہے
پیراہنِ جاں ہے تیرا بدن جب کہنہ ہو تو اُترتا ہے
اس دل پہ فنا کا کیا ہے عمل جو کام بقا کے کرتا ہے
ہم ساقیٔ دہر کے ساغر ہیں
خالی کرتا ہے، بھرتا ہے

بقا

پائندہ مقصدوں سے ہے پائدار ہستی
جاں بھی بدن کی صورت ورنہ ہے آنی جانی
دل بھی ہے ایک کھیتی کر اس کی آبیاری
حسنِ عمل سے باقی رہتی ہے زندگانی
اس آبجو کو لے جا گلزارِ زندگی میں
ریگِ فنا میں ورنہ ہو گا یہ جذب پانی
اوج و عروجِ انساں انعام جہد کا ہے
ہر ایک فرد خود ہے اپنی بقا کا بانی
اپنی بقا کما لے اے دل وگرنہ تجھ کو
زندہ نہ رکھ سکے گی فطرت کی مہربانی

فنا و بقا

ہر ایک شے یہاں خسِ آتش سوار ہے
ہستی ہر ایک چیز کی جستِ شرار ہے
تنویرِ مہر و ماہ بھی موجِ سراب ہے
سب کی چمک ستارۂ ثاقب کی تاب ہے
ہر چیز پَر فشاں صفتِ گردِ راہ ہے
کوہِ گراں بھی صورتِ خاشاک و کاہ ہے
محشر بپا ہر ایک جزو و کُل میں دیکھیے
یعنی ہر ایک شے کو تزلزل میں دیکھیے

ہے جنبشِ نسیم سے موج اضطراب میں
ہے عکسِ ماہ موج سے کس پیچ و تاب میں
چاند، ارتعاشِ موج سے لیکن جُدا رہا
پرتو ہی اس کا تھا کہ جو سیماب پا رہا
ہے اضطرابِ عکس جُدا ماہتاب سے
حُسنِ ازل بری ہے ہر اک انقلاب سے

سُن گوشِ دل کہ غیب سے آتی صدا مجھے
عرفانِ رازِ دہر ہے تسکیں فزا مجھے
دَورِ خزاں بھی وجہِ قیامِ بہار ہے
صبحِ ازل سے یہ روشِ روزگار ہے
ہستی کی کارگہ میں سکوں کا نشاں نہیں
رمز آشنا کو اس پہ فنا کا گماں نہیں
آئینِ انقلاب سے زندہ ہے کائنات
ہے جنبشِ دوام یہاں مایۂ حیات
کہتے ہیں جس کو موت وہ بطنِ حیات ہے
اک ذات میں تغیرِ رنگِ صفات ہے
ہستی یہاں کوئی بھی فنا آشنا نہیں
دنیا میں اک اجل ہے کہ جس کو بقا نہیں

کائنات

ہر طرف کائنات بے پایاں
اس کا پیدا کہیں کنار نہیں

ایک ذرّہ ہے بس زمیں اپنی
ذرّہ کچھ وجہِ افتخار نہیں

آسمانوں کی وسعتوں میں کیا
اور ایسے جہاں ہزار نہیں ؟

کیا ہیں بے روح سب کے سب تارے
کوئی دل اِن میں بے قرار نہیں ؟

زمزمہ زندگی کا ہو جس میں
کیا ستاروں میں کوئی تار نہیں ؟

کیا خدا کا ہے بس زمیں مسکن
کیا کہیں اور کردگار نہیں ؟

کیا ہے سب کائنات ریگِ رواں
کیا کہیں گرد میں سوار نہیں ؟

ہے نہاں آرزو کی بے تابی
کیا وہاں کوئی خلفشار نہیں ؟

ہر ستارہ ہے اک دلِ مضطر
کوئی بے جان زینہار نہیں

کون یہ کہہ سکے کہ جان وہاں
ہم سے بھی بڑھ کے تابدار نہیں

کون یہ کہہ سکے انھیں حاصل
ہم سے اولیٰ تر اقتدار نہیں

ہم سے کچھ بڑھ کے ہوشمند نہیں
ہم سے کچھ بڑھ کے پائدار نہیں

غلط اہلِ زمیں کا ہے دعویٰ
ہم کو کچھ اس پہ اعتبار نہیں!

ایک خواب

خواب میں ، ایک مرتبہ دیکھا
مَیں نے پایا ہے گوہرِ مقصود تم

خواب ہی میں یہ دل میں شک گزرا
واہمہ کی کہیں یہ ہو نہ نمود

خواب ہی میں یہ پھر یقین ہوا
نہیں موہوم شے، یہ ہے موجود

خواب یہ دیر تک رہا جاری
خوب خورسند تھا دلِ مسعود

پر کھلی آنکھ جب تو کیا دیکھا
صورتِ نقشِ آب سب مفقود

اس پہ فوراً مجھے خیال آیا
یہ زمین و زماں یہ ہست و بود

زندگی مَیں سمجھ رہا ہوں جسے
ہو کہیں وہم کا نہ تار و پود

ہوں کہیں سر بہ سر نہ بے بنیاد
نغمۂ نے، نوائے چنگ و عود

سلسلہ ہائے علّت و معلول
سارے آئین اور رسوم و قیود

سر بسر وہم کا نہ ہو چکّر
گردشِ اخترانِ چرخِ کبود

نقشِ پا جادۂ خیال میں ہوں
دینِ مسلم، رہِ مغان و یہود

سب حقیقت کا اک حجاب نہ ہو
اور ہم رنگِ نقشِ خواب نہ ہو

کوزہ گرِ دہر

یہ دہر کہ جامِ جم بنائے
ہر روز نئے صنم بنائے

خود اپنے ہی جام توڑتا ہے
کہنہ اصنام توڑتا ہے

مے خانے میں جام نو بہ نو ہیں
دنیا میں نظام نو بہ نو ہیں

ہستی کی سرشت میں ہے تغییر
ہر روز نئی ہے اس کی تعمیر

ہستی کو جمود سے ہے نفرت
آئین و قیود سے ہے نفرت

فرق اس کے خرام میں نہ آیا دریا کبھی دام میں نہ آیا
مت روک حیات کی روانی سڑتا ہے ضرور بند پانی
آئین ہے زندگی کا تجدید
یعنی ہے دلوں کی موت تقلید

عہدِ نو

انساں کی بدل رہی ہے تقدیر ہر جبر کی ٹوٹتی ہے زنجیر
زنداں کے تمام در کھُلے ہیں پنچھی اُڑتے ہیں پَر کھُلے ہیں
صیاد کے اب نہیں ہیں بس میں طائر نہ رہیں گے اب قفس میں
شاہی نہ کوئی بھی شہ رہے گا ہر تخت کا بن گیا ہے تختا
پہلے کے کہاں حدود باقی ان کا نہیں اب وجود باقی
گزری ہوئی شے کا نام کیوں لیں تقویمِ کہُن سے کام کیوں لیں
اب خوابِ گراں سے جاگتے ہیں پیروں سے مُرید بھاگتے ہیں
سرمائے کا دیو کانپتا ہے منہ شرم سے اپنا ڈھانپتا ہے
آقائی گئی، گئی غلامی! سیرت سے ہے آدمی گرامی
تھوڑا ہے قدیم رنگ باقی
آزادی کی کچھ ہے جنگ باقی

ماضی پرست

ہر ملّت مُردہ ہے یہ کہتی عہدِ زرّیں تھا میرا ماضی

ماضی میں تھے سارے لوگ دانا　　ہر اک تھا حکیم اور سیانا
دنیا سے تھے آخرت کے رشتے　　آتے تھے زمین پہ فرشتے
مَر کر جو زمین میں گڑا ہے　　زندوں سے وہ سَو گنا بڑا ہے
وہ خوبیٔ حال اب نہیں ہے　　پہلا سا کمال اب نہیں ہے

طاری ہے کچھ ایسی خاکساری　　ہیں نقشِ قدم کے سب پجاری
اوہامِ کہن کی ہے اسیری　　ہر جا ہے لکیر کی فقیری
جدّت ہے بڑا قصور گویا　　ہر نو میں ہے کچھ فتور گویا
پیچھے کی طرف مڑی ہے گردن　　ماضی میں تھا سارا علم اور فن
تدبیر کرے نہ کچھ خرد مند　　دروازے ہیں اجتہاد کے بند
مطرب کا یہی ہے اب ترانہ　　پیچھے کی طرف چلے زمانہ

تقلید کی زندگی ہے اک موت　　مطلب ہی حیات کا ہوا فوت
یہ حضرتِ نقشبند کا قول　　ہے عارفِ ہوشمند کا قول

"یک گربۂ زندہ اے فسردہ
بہتر ز ہزار شیرِ مردہ!"

تغیّر

وقت کی تیز ہے کیا شمشیر　　کاٹتی ہے ہر اک تدبیر
بگڑ گئی ہر اک تصویر　　ٹوٹ گئی ہر اک تعمیر

یہ بھی گیا اور وہ بھی گیا
باقی ہے بس نامِ خدا

بچپن ہے کہ جوانی ہے — ہر رُت آنی جانی ہے
دہر میں سب کچھ فانی ہے — درد انگیز کہانی ہے

یہ بھی گیا اور وہ بھی گیا
باقی ہے بس نامِ خدا

مل گئے خاک میں تاج اور تخت — گرتے ہیں جیسے کہنہ درخت
حاکم نرم اور ظالم سخت — وہ خوش بخت اور یہ بدبخت

یہ بھی گیا ....

جہاں پہ پہلے تھے کہسار — وہاں ہیں اب بحرِ ذخّار
جہاں تھے پہلے شہر و دیار — بُوم وہاں ہیں پہریدار

یہ بھی گیا ....

تارے بھی جاتے ہیں ٹوٹ — جیسے ساغر جائیں پھوٹ
وقت کی عالم گیر ہے لوٹ — گئے کھلونے ہاتھ سے چھوٹ

یہ بھی گیا ....

نیا ہے غم اور نئی ہے عید — جدّت میں ہے کہاں تقلید
دہر کو ہے شوقِ تجدید — کرتا ہے خود اپنی تردید

یہ بھی گیا اور وہ بھی گیا
باقی ہے بس نامِ خدا

ہر شے میں ہے سرعتِ سیر
ٹکتے نہیں دنیا کے پیر
کیوں نقد یہ سے رکھیں بیر
ہے تغییر میں سب کی خیر
یہ بھی گیا ......

گزرے ہوئے کو یاد نہ کر
دل کو عبث ناشاد نہ کر
وقت کو یوں برباد نہ کر
کام کر اور فریاد نہ کر
یہ بھی گیا اور وہ بھی گیا
باقی ہے بس نامِ خُدا

لفظوں کی پُوجا

اے راہزنِ حیاتِ انساں
ہے قلب کی موت "لفظِ بے جاں"
اے دشمنِ راہِ حق پرستی
زنجیرِ گرانِ پائے ہستی
معنی کیے نقشِ آب تُو نے
دینوں کو کیا خراب تُو نے
تجھ سے ہے بلندیوں میں پستی
سکھلاتا ہے تو سکوں پرستی
اے کاش سکوں کے آرزومند
ہوتا نہ خیال تیرا پابند
دل تیرا اگر ارتقا کو ڈھونڈے
بجلی ترے نقشِ پا کو ڈھونڈے
تو نے ہی کیا اسیرِ باطل
آزاد ہیں تجھ سے پائے درگل
امواج کو کر دیا ہے ساحل
جادہ کو بنا لیا ہے منزل
سب بڑھتے ہیں ہستیِ رواں میں
تو رو بہ قفا رہا جہاں میں
الفاظِ کہن کی بُت پرستی
ہے موت کی جاں یہ چیرہ دستی

الفاظ کے دام میں نہ آنا
اس سحرِ حرام میں نہ آنا

ملّتِ مُردہ

ملّتِ مُردہ پڑھتی ہے علم ہے جتنا دقیانوس
علم و ہنر میں آگے بڑھ اور نہ ترقی کر معکوس
آتش ہے تحقیقِ جدید جل گیا اس سے پرانا پھوس
جس تخریب میں ہو تعمیر
وہ نقصان نہ کر محسوس

نعمتِ حق ہے بے پایاں کافر ہے جو ہو مایوس
جامہ بدلتی ہے ہستی نت ہے نیا اس کا ملبوس
ڈھل نہیں سکتا اس کا شباب ہے یہ سدا بہار عروس
شعلۂ لعل نہیں بجھتا شمعِ مہر ہے بے فانوس
دل کو بری تقلید سے کر آزادی سے ہو مانوس
فطرت راز چھپاتی ہے
علم ہے انساں کا جاسوس

ماضی اور حال

ماضی کا سماں گزر گیا ہے تھا اس کا جو کام کر گیا ہے

قانونِ فنا سے مر گیا ہے گو چھوڑ کے کچھ اثر گیا ہے
حاضر کے جمال پر نظر رکھ
زندہ ہے تو حال پر نظر رکھ

ہنگامے وہ اب کہاں ہیں باقی ماضی کے بس استخواں ہیں باقی
بلبل ہیں نہ آشیاں ہیں باقی وہ باغ نہ باغباں ہیں باقی
اب تازہ نہال پر نظر رکھ
زندہ ہے تو حال پر نظر رکھ

اب بھول شبِ گزشتہ کا راگ نکلی ہے نئی سحر ذرا جاگ
ماضی کے اثر سے اس طرح بھاگ جس طرح اتارے کینچلی ناگ
تازہ پر و بال پر نظر رکھ
زندہ ہے تو حال پر نظر رکھ

پھینک اس کو قبا جو ہے پرانی فطرت میں ہے نت نئی جوانی
گزرا ہوا دَورِ زندگانی دُھندلا سا ہے خواب یا کہانی
مت اس کے زوال پر نظر رکھ
زندہ ہے تو حال پر نظر رکھ

مُردوں پر نہ کر تو اشکباری بیکار ہے ایسی آبیاری
جس فیض نے زندگی ابھاری وہ فیض ابھی تلک ہے جاری
اس فیض کی چال پر نظر رکھ!
زندہ ہے تو حال پر نظر رکھ!

انسان

(تصویر کے دو رُخ)

(۱)

تقدیر کا ہے مارا بے تابی میں ہے پارہ
ٹوٹا ہوا اک تارہ ہستی میں ہے آوارہ
انساں ہے بے چارہ، انسان ہے بے چارہ

اچھا کہ بُرا ہے یہ، کیا جانیں کہ کیا ہے یہ
صرصر کا دیا ہے یہ بس نذرِ فنا ہے یہ
انسان ہے بے چارہ، انسان ہے بے چارہ

ٹلتی نہیں تقدیریں ہیں پاؤں میں زنجیریں
کیا اس کی ہیں تدبیریں ناکامی کی تفسیریں
انسان ہے بے چارہ، انسان ہے بے چارہ

بے درد زمانہ ہے ظلموں کا فسانہ ہے
چکی میں یہ دانہ ہے پسنا ہے پسانا ہے
انسان ہے بے چارہ، انسان ہے بے چارہ

وہموں کا پجاری ہے سایوں کا شکاری ہے
نوری ہے کہ ناری ہے بے تابی سی طاری ہے
انسان ہے بے چارہ، انسان ہے بے چارہ

یہ بے تب و تاب انساں یہ خانہ خراب انساں !

صحرا میں سراب انساں دریا میں حباب انساں

انسان ہے بے چارہ ، انسان ہے بے چارہ

(۲)

دیدار کی بے تابی ، کرتی ہے نظر پیدا !

خود راہ کے ذرّوں سے ہوتے ہیں خضر پیدا !

اور زادِ سفر پیدا

فطرت نے جسے توڑا ، یہ جوڑ بھی دیتا ہے

اصنام بناتا ہے ، پھر چھوڑ بھی دیتا ہے

اور توڑ بھی دیتا ہے

ذرّہ ہے مگر بندے ہیں شمس و قمر اس کے

ہے آتشِ ہستی یہ، تارے ہیں شرر اس کے

بجلی کے ہیں پَر اس کے

یہ جامع ہستی ہے ، ہر شے کا ہے ست اس میں

خلقت کا شرف اس میں ، خالق کی صفت اس میں

قوت ہے بہت اس میں

ورثے میں ملی اس کو تسخیر جہانوں کی

اک کھیل سمجھتا ہے تغییر جہانوں کی

تقدیر جہانوں کی

نقصان و غم و غصّہ تدبیرِ الٰہی ہے
ہمّت کے لیے دعوت ہر نقص و تباہی ہے

انسان سپاہی ہے

فریبِ انقلاب

بپا ہے حشر، زمانے میں انقلاب آیا! — وہ سامنے سوا نیزے پہ آفتاب آیا
نہیں ہے خاک کے ذرّوں میں بھی سکون و جمود — کہ ذرّے ذرّے کو پیغامِ اضطراب آیا
تُلیں گے کفّۂ میزاں میں ملّتوں کے عمل — فراعنہ کے لیے محشرِ حساب آیا
حیاتِ آدمِ خاکی، خموشِ استفہام — حروفِ شعلہ میں لکھا ہوا جواب آیا

ضیائے نو سے ہوئی محفلِ کہن روشن
جہانِ پیر کو پھر نشّۂ شباب آیا

○

مگر فریب نہ ہو اور ظلمِ کہنہ اساس — پہن کے عدل کا دلکش نقاب آیا ہو
شدید تشنہ لبی کو لبھانے کی خاطر — بجھانے پیاس ہماری، سراب آیا ہو
اسی بہانے ہوا ہو سبک سروں کا عروج — اُبھر کے سطح پہ ہر اک حباب آیا ہو

قمارِ دہر میں ہاری ہو عشق نے بازی
ہوس زدوں میں ہر اک کامیاب آیا ہو

پیغامِ عمل

کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر
بارشِ تیرِ حوادث میں جگر پیدا کر

گرم رو ہو کہ جہاں نقشِ قدم ہو تیرا
اس کفِ خاک میں بھی برق کے پَر پیدا کر

تو اگر چاہے کہ گم ہو شبِ تاریک تری
سینۂ چاک بہ اندازِ سحر پیدا کر

قطرہ آغوشِ تلاطم میں گہر بنتا ہے
آبرو چاہے تو طوفان میں گھر پیدا کر

خواہشِ تیغ کو ہے قوتِ بازو بھی شرط
آرزو تاج کی ہے تجھ کو تو سر پیدا کر

تیرے سینے میں اگر آتشِ خودداری ہے
چوٹ تجھ پر جو پڑے اور شرر پیدا کر

تیغِ ہستی کے لئے سنگِ فساں ہے درکار
راہ ایمن ہے تو خود اس میں خطر پیدا کر

ترانۂ حیات

(ترجمہ از لانگ فیلو۔ "سام آف لائف")

مجھ سے نہ کہہ اس درد و الم سے ہستی ہے مثلِ خواب مری
کام ہے نقش بر آب مرا، امید طلسمِ سراب مری

نیند کی ماتی روح ہے مُردہ، مُردہ ہے جو بے تاب نہیں
چہرۂ بود پہ رنگِ نمودِ دھر بغیر حجاب نہیں
ہستی اصلی خلقت سچی، قبر نہیں انجام اس کا!
خاک کا پُتلا خاک ہے آخر، روح نہیں پر نام اس کا

روح و محن مقصود نہیں اور عیش نہیں معراج ترا
جد و جہد میں ایسے بسر کر کل سے ہو بہتر آج ترا
کام ہے بھاری، وقت سبک پا، جاں ہے پا بر کاب تری
عمرِ رواں کو بانگِ جرس آوازِ دلِ بیتاب تری

جنگ کا ہے میدان یہ دنیا دیکھ مصافِ ہستی کو
چھوڑ دے عجز پرستی کو اور ڈھونڈ نہ راہِ پستی کو
یادِ زمانِ رفتہ کو تو پائے دل کی زنجیر نہ کر
اور فضائے فردا ہی میں قصرِ طلا تعمیر نہ کر

ماضی ہے مردہ اور مستقبل اب تک بطنِ عدم میں ہے
حال ہے زندہ اس میں دکھا کچھ دم باقی گر دم میں ہے
کام مشاہیرِ دنیا کے اب بھی کر سکتے ہیں ہم
یاں سے گزر جائیں تو چھوڑیں دہر پہ ایسے نقش قدم

نقشِ قدم رہ گم کردہ کو دستِ خضر بن جائیں جو
یاس کی شب میں بہرِ مسافر صبحِ سحر بن جائیں جو
اُٹھ مرے ہمدم باندھ کمر اور صبر سے گرمِ کار ہو تو
پھر ترے سر پر جو آئے سہنے کے لیے تیار ہو تو

۴

"ذوقِ نظر"

صُبح

عشق کا یہ شہود ہے اے دل
حُسن کی یہ نمود ہے اے دل

شاخیں اٹھتی ہیں اور جھکتی ہیں
یہ قیام و سجود ہے اے دل

ذرّے ذرّے میں انشراحِ صدر
سب میں ذوقِ نمود ہے اے دل

نہیں نغمہ سرا پرندے ہی
پھُول میں بھی سرود ہے اے دل

یہ سویرا ہے لہر امرت کی
نُورِ یزداں کی رود ہے اے دل

زندگی کا حسین ہے پیراہن
رنگ و بُو، تار و پود ہے اے دل

ہے دل آویز آبشار کا راگ
نغمۂ چنگ و عود ہے اے دل

پتھروں میں بھی زندگی ہے عیاں
سنگ بھی بے جمود ہے اے دل

چشمۂ جود ہے سدا جاری
فیضِ ربِّ ودود ہے اے دل

درِ فردوس وا ہے وقتِ سحر
آ جو ذوقِ خلود ہے اے دل

ذوقِ نظر

دامن پھیلایا جب نظر نے
پھولوں سے بھرا اُسے سحر نے

دامانِ نظر میں شب کے تارے
آنکھوں نے فلک سے ہیں اُتارے

کشور مرے سات آسماں ہیں سکّے مرے چرخ پر رواں ہیں

شاہوں سے مجھے حسد نہیں ہے املاک کی میرے حد نہیں ہے

قلزم بھی ہے میرے دل کی اک نہر رقصاں ہے مجھی میں اس کی ہر لہر

اختر ہے کہ لعل یا گہر ہے قیمت اُس کی بس اک نظر ہے

درویشی نظر سے ہے امیری ہے بے نظری فقط، فقیری

کونین کی دولتیں ہیں جاں میں
کنگال نہیں کوئی جہاں میں

فطرت

نظر ہو جو پیدا تو ہے بے حجاب وگرنہ ہے نظّارہ خود اک نقاب

ہے دلکش تو اے فطرتِ نغمہ ریز ازل سے ابد تک ہے تیرا شباب

کبھی تو رباب اور مضراب مَیں کبھی تو ہے مضراب اور مَیں رباب

ترا آئینہ میں، مرا عکس تو تو میرا جواب اور مَیں تیرا جواب

ادھر ذرّہ ہے عالمِ بے حدود اُدھر محض ذرّہ ترا آفتاب

ادھر قطرے قطرے کا ہے ناپ تول اُدھر ہے خزانہ ترا بے حساب

تماشا ہے تیرا بہت دل پذیر اُبھرتے ہیں یاں آنکھ بن کر حباب

ترے چند لمحے ہمارے قرون ہے تاریخِ انساں ترا ایک خواب

تری کشمکش ہے طریقِ عروج نئی آفرینش کا ہے پیچ و تاب

صحیفے مذاہب کے سب تیری شرح
حقیقت میں تو ہی ہے اُمّ الکتاب

جو سایۂ یہ ہے تو وہ آفتاب کیا ہوگا

کبھی دکھاتا ہے قوسِ قزح میں رعنائی
فروغ مہ میں کبھی رہزنِ شکیبائی
وہی کبھی رُخِ لالہ پہ رنگ بنتا ہے
وہی کبھی مرے دل میں اُمنگ بنتا ہے
ہزار شکل میں جلوہ فروز ہوتا ہے
ہر ایک رنگ میں نظارہ سوز ہوتا ہے
جہانِ رنگ کا رنگیں حجاب ہے اس کا
رُخِ حسیں یہاں زیرِ نقاب ہے اس کا
نقاب یہ ہے رُخِ بے حجاب کیا ہوگا
جو سایہ یہ ہے تو وہ آفتاب کیا ہوگا

سبزۂ کشمیر

سب برگ و بار سبز ہیں اور شاخسار سبز
یعنی کہ نغمہ سبز ہے اور ساز و تار سبز
پیڑ اس طرف ہیں سبز اُدھر کوہسار سبز
یاں فوج سبز پوش ہے واں ہے حصار سبز

مانندِ سایہ نقشِ قدم کے نشاں نہیں
ہے خطِ جادہ ، دیکھ سرِ رہگذار سبز

محرومِ نامیہ سے کفِ دستِ تنگ نہیں
شک ہو اگر تو دیکھ لے برگِ چنار سبز

آنکھوں میں ہے تصورِ گیسوئے پُرشکن
سنبل کے عکس سے ہے کوئی آبشار سبز

ہر چیز زیبِ تن ہے کیے حُلّۂ بہشت
میدان و کوہسار ، یمین و یسار سبز

ہر نخلِ سبز ، سبز زمیں پر ہے جھومتا
گویا ہے اسپِ سبزہ کے اوپر سوار سبز

ممکن ہے پڑ گئی ہو تنِ مردہ میں بھی جاں
جوشِ نمو میں ہے رگِ سنگِ مزار سبز

نوخیز برگ رقص کناں شاخِ سبز پر
نے سبز اور اُس پہ چڑھا نے سوار سبز

ہر برگ نخل پر ہے انا الحق سرا ہوا
منصور سبز پوش ہیں اور چوبِ دار سبز

سبزے سے ہے جو خاک کا عنصر بدل گیا
ہے توسنِ نسیم سے اٹھتا غبار سبز

خامہ تھا چوبِ خشک جو محوِ بیاں ہوا
ذکرِ بہار سے ہُوا پھر ایک بار سبز!

ڈل بیری نگر

شام کو رنگِ شفق ہے جلوہ فگن آب میں
سخت حیراں ہوں یہ گلخن ہے کہ گلشن آب میں

خشکیٔ زاہد کہاں ہے، کوہ و دشت و گلستاں
سر بسبز ہو گیا ہر اک کا دامن آب میں

وہ صفا پانی میں ہے، رشتہ اگر گم کیجئے
ڈھونڈ لانے گی نگاہِ چشمِ سوزن آب میں

اے کہ تابستان سے اتنا سراسیمہ ہے تو
سیر کر ڈل کی بجھا لے سوزشِ تن آب میں

ہے سفینہ شعر کا اور شاعری خامہ بدست
ناؤ پہ چپّو لئے بیٹھی ہے ماہجن آب میں

سایۂ سروِ لبِ جو کو تڑپاتی ہے موج!
زُلفِ پُر خم ہے کہ لہراتی ہے ناگن آب میں

بازیٔ موج و نسیم ایسی نشاط انگیز ہے
یاد آجاتا ہے بوڑھوں کو بھی بچپن آب میں

غوطہ زن ہیں سبزۂ روئیدہ اور دلکش کنول
سبز پوشانِ بہشتی تا بگردن آب میں

ہر دیے کی جگمگاتی ہیں شعاعیں تہہ تلک
اور ہو جاتی ہے بینا چشمِ روشن آب میں

شبنم

پتوں پہ پڑی ہوئی ہے کچھ اوس
اپنے لبِ تر سے ہے چمن بوس

چمکائے فلک نے شب کو تارے
تھوڑے سے زمین پہ اُتارے

دھویا ہے یہ صبح نے رُخِ گل
یا گُل پہ گرے ہیں اشکِ بُلبُل

کیا نور ہے اس میں کیا صفا ہے
گویا دلِ پاک کی دعا ہے

ہے منتظرِ نگاہِ خورشید
پیغامِ فنائے لذتِ دید

وابستہ نہیں یہ اس چمن سے
شاید کہ یہ دُور ہے وطن سے

بیتاب ہے کس قدر یہ قطرہ
ہے اس کو کثافتوں سے خطرہ

صاف آئی ہے صاف اُڑ گئی ہے
پھر اپنے وطن کو مُڑ گئی ہے

اُفتاد نے خاک پہ اُتارا
پرواز نے پھر اسے ابھارا

تھی یادِ وطن سے آنکھ نمناک
پاکیزہ رہا یہ گوہرِ پاک

پاکیزہ ہے آب اس گہر کی
تعلیم ہے پاکیٔ نظر کی

مسکن ہے یہاں حرام اے دل
کرنا نہ یہاں قیام اے دل

کالی گھٹا

آ گئی وہ جھومتی کالی گھٹا
خوب پی کر مست متوالی گھٹا

رحمتوں کی گود کی پالی گھٹا
بجلیوں اور چشمکوں والی گھٹا

آ گئی وہ جھومتی کالی گھٹا

خوب ہے ٹھنڈی ہوا برسات میں　　کیا ہے نزہت کی فضا برسات میں
سارا عالم ہے ہرا برسات میں　　قطرہ دریا آشنا برسات میں
آ گئی وہ جھومتی کالی گھٹا

دہر مانندِ سحر تازہ ہوا　　نخل ہر اک ہو کے تر، تازہ ہوا
ذرّہ مانندِ گہر تازہ ہوا　　دل میں پھر ذوقِ نظر تازہ ہوا
آ گئی وہ جھومتی کالی گھٹا

بادہ خواروں کے لیے توبہ شکن　　شاعروں کے واسطے تزئینِ فن
من میں بھی اُس نے کھلائے ہیں چمن　　ہے سخن میں بھی شگفتہ نسترن
آ گئی وہ جھومتی کالی گھٹا

اے گھٹا نِت نِت برس، جھم جھم برس　　نغمہ بن، ٹپ ٹپ برس، چھم چھم برس
بن کے جان و روح کی محرم برس　　آ مٹا دے سارے نقشِ غم برس
آ گئی وہ جھومتی کالی گھٹا

عکسِ ماہ

ہے جنبشِ نسیم سے موجِ اضطراب میں
ہے عکسِ ماہ موج میں کس پیچ و تاب میں
لگتے ہیں جوئبار کو لرزے سے چار چاند
پانی میں ایک چاند سے پیدا ہزار چاند
چاند ارتعاشِ موج سے لیکن جُدا رہا
پر تو ہی اس کا تھا کہ جو سیماب پا رہا

ہے اضطراب عکس جُدا ماہتاب سے
حُسنِ ازل بری ہے ہر اک انقلاب سے

دھنک

(ترجمہ از ورڈز ورتھ)

آکاش کی فضا میں دلکش دھنک کا منظر
کیسا ہے رقص آور
کیفیت اپنے دل کی بچپن میں بھی یہی تھی
کیا لُطف کیا خوشی تھی
اب آفتابِ عمری نصف النہار پر ہے
دل پر وہی اثر ہے
پیری میں جب ضعیفی مجھ کو کماں بنا دے
تن کو مرے جُھکا دے
ہے یہ دُعا کہ تب بھی ہو یہ سرور باقی
یہ دل کا نُور باقی
ورنہ ہے موت بہتر بے کیف زندگی سے
عاری ہو جو خوشی سے
طفلی سے تا بہ پیری ہستی میں ہو تسلسل
غنچے سے لے کے تا گُل
سلکِ سرور میں ہوں ایّامِ عمر سُفتہ
اور دل رہے شگفتہ

۵

فن و فنکار

کلام حکیم

فنِ لطیف

فقط فطرت کی نقالی ہو جب فن
تو وہ کاغذ کے پھولوں کا ہے گلشن

فن اپنے رنگ سے خالی نہیں ہے
یہ ہے تخلیق نقّالی نہیں ہے

جدا اس کی زمیں اور آسماں ہے
یہ اپنے دل کی دنیا کا بیاں ہے

نہیں نغمہ کسی آواز کی نقل
دلِ انساں نہیں ہے ساز کی نقل

ہے فطرت میں جمال اور کبریائی
مگر انساں کے اندر ہے خدائی

تو تصویروں میں دل کا رنگ بھر دے
صداؤں میں روح کا آہنگ بھر دے

تخیّل اور نغمہ

ہے نغمہ تخیل کا تصویر گر
اسی سے ہے تخلیق اشعار کی

خط و رنگ کی نہ ہیں ہے کوئی
جو جاں ہے مصوّر کے شہکار کی

○

ہے روحوں کو نغمے سے حاصل فراغ
یہ ہے بادۂ بے خودی کا ایاغ

دلوں سے دلوں تک ہے جو راستہ
کسی لے سے ملتا ہے اس کا سُراغ

○

یہ ادراک کا ہے فریبِ نظر — کہ جاں اور شے ہے جہاں اور شے
ہے باطن سے ظاہر کی دنیا الگ — عیاں اور شے ہے نہاں اور شے

○

مگر زیر و بم میں یہ کھُلتا ہے راز — کہ ہے سب زمان و مکاں ایک شے
حیات ایک وحدت ہے، اور دل ہی دل — یہ دل ہے یہاں اور وہاں ایک شے

شاعر

تاروں سے چمک، بجلی سے تڑپ، بادل سے اشک فشانی لی
کچھ دیدۂ طفلِ کم سن سے ہر شے کے لئے حیرانی لی

پھولوں سے دریدہ پیراہن، شمعوں سے روح گدازی لی
بلبل سے ترانہ سیکھا اور پروانوں سے جاں بازی لی

ہلکی سی غذائے روح کبھی ٹھنڈی سی شبِ مہتاب سے لی
کچھ مستی جاں پرور مَیں نے آنکھوں کی شرابِ ناب سے لی

جذبات کا مَیں آئینہ ہوں اور حکمت کا گنجینہ ہوں
جس میں تھی امانت حق نے رکھی، مَیں اس آدم کا سینہ ہوں

مَیں مُونسِ نوعِ آدم ہوں، مَیں خستہ جگر کا مرہم ہوں
میں پردہ نوازِ ہستی ہوں، مَیں محرمِ رازِ عالم ہوں

عابد کا ذوقِ عبادت بھی، دھندلی سی ہے اک تصویر مری
کیا کعبہ اور کیا بُت خانہ، کہنہ سی ہے اک تعمیر مری!

تخئیل کا گو صورت گر ہوں، مت جان فقط آذر ہوں مَیں
کرتا ہوں بات اشاروں میں، سُلجھا ہوا اک رہبر ہوں مَیں

ہر شے کی بدلتی ہے صورت، آتی ہے جو میرے سائے میں
ہو عیب بدل کر خوبی گر، ڈھل جائے مرے پیرائے میں

اک بحرِ ازل کی موج ہوں میں، آوارہ ہوں مستانہ ہوں
ہشیار ہوں اپنے مقصد میں، گو ظاہر میں دیوانہ ہوں

پابند ہے عقل آزاد ہوں مَیں، افسردہ ہے وہ دلشاد ہوں مَیں
دنیا ہوں تنہا میں اپنے ویرانے میں بھی آباد ہوں مَیں

ہوتا نہ ظہور اگر میرا فطرت خاموش ہی رہ جاتی
انسان کی جہدِ علم و عمل بیہودہ کوشش ہی رہ جاتی

ہاں ہر محسوس کے پردے میں کچھ حُسنِ نامحسوس بھی ہے
شمع باطن کی ہے یہ ضیا روشن گرچہ فانوس بھی ہے

اس عالم میں ہے میرا گزر جس جا پہ جلیں جبریل کے پر
عقل و احساس کی حدِّ نظر ہے میرے لیے آغازِ سفر

ہر قید کو مَیں ناپید کروں، محدود کو لامحدود کروں
مَیں ہوں وہ طلسمِ خلّاقی، موہوم کو بھی موجود کروں

جو پردۂ محسوسات میں ہے وہ راگ مری ہر بات میں ہے
مَیں حُسن و عشق کا جوہر ہوں بیتاب جو ہر اک ذات میں ہے

ہے نشہ نہاں جیسے مَے میں نغمہ ہے میری رگ و پے میں
ہر لفظ کو میں دیتا ہوں پرو گوہر کی طرح دل رس لے میں

ادنیٰ سا عطیہ ہے میرا جو کیف سرور و سور میں ہے
تلچھٹ بھی نہیں ساغر کی مرے نشہ جو مئے انگور میں ہے
خلوت میں بزم سجاتا ہوں، جلوت میں اگر میں گاتا ہوں
وہ حُسن دیا حق نے مجھ کو میں ہر اک رنگ میں بھاتا ہوں
وہ سحر عطا فطرت نے کیا جو زھر کو بھی تریاق کرے
انساں کا حسابِ سُود و زیاں اک لمحے میں بیباق کرے
جنگِ اضداد میں ہستی کی انساں کو صبر و سکوں مجھ سے
ہے لعل معانی بن جاتا مژگاں پہ قطرۂ خوں مجھ سے
پابستہ عقلِ جہاں پیما جب آب و گِل میں رہتی ہے
جس شے کے لئے ہے سرگرداں وہ میرے دل میں رہتی ہے
آوازِ الست کو کانوں میں انسانوں کے محفوظ کیا
مستی میں نہیں جو اس لذت سے جانوں کو محظوظ کیا
جس کو ہو مُیسّر یہ دولت قارون کو ایک گدا سمجھے
اور جاہ و مال کا سُود و زیاں اک فتنہ اور بلا سمجھے

حُسنِ مطلق

تصویر ہے ایک شعرِ خاموش — رنگوں میں نوا ہوئی ہے مدہوش
ہے راگ بھی ایک شعرِ بے حرف — بادہ ہے وہی، ہے مختلف ظرف
نغمہ ہے ہر اک حسین تعمیر — حیرت سے جو بن گیا ہے تصویر

آئینۂ حق ہے حُسنِ صورت ہے شکلِ جمیل حق کی مورت
نیکی بھی تو حُسن ہے عمل کا حادث میں بھی رنگ ہے ازل کا
جو حُسن نوا و رنگ میں ہے پوشیدہ شرار و سنگ میں ہے
ہے حُسنِ رُخِ حیات بے حد اک ذات کے ہیں صفات بے حد

وحدت میں جو امتیاز ہے یہ
حُسنِ مطلق کا راز ہے یہ

"بشنو از نے"

بڑے درد سے کہہ رہی ہے یہ نے
کہ اس سے پرے اور عالم بھی ہے
وہ عالم مگر دُور دل سے نہیں
یہیں ہے کہیں وہ یہیں ہے کہیں
یہ دل سوز کیوں نغمۂ ساز ہے
کسی آشنا کی یہ آواز ہے
ہم آغوش ہیں اس میں درد و سرور
نہیں امتیازاتِ غیب و حضور
خودی کا ہے آئینہ یہ بے خودی
بڑی ہوشیاری ہے یہ بیہشی
ہے ساحل پہ سب قیل و قال و سخن
سمندر میں نغمہ ہوا غوطہ زن!

شاعر

مہتاب جس طرح ہے تاروں کی انجمن میں
یا بلبل نوا گر نغمہ سرا چمن میں

اس نے پرو لیے ہیں تارِ نظر میں تارے
شبنم کے قطرے جیسے خورشید کی کرن میں

ہے دیکھتا بہاریں برگِ خزاں میں خفتہ
بیتاب ہیں شرارے پتھر کے بھی بدن میں

فردوس جھومتے ہیں لفظوں کی جنبشوں میں
کوثر کی موج ہے اک گویا زباں دہن میں

جس طرح ہو ہوا سے تارِ رباب لرزاں
یا بھینی بھینی خوشبو پھولوں کے پیرہن میں

لبریزِ رازِ فطرت، جدت طرازِ فطرت
خاموش تھی ازل سے گویا ہوئی سخن میں

جذبات کی نہ کرتا شاعر جو ترجمانی
گونگوں کی طرح رہتی ہر من کی بات من میں

فطرت ہے حسن کا فن، فن میرا عینِ فطرت
اپنے کو دیکھتا ہوں آئینۂ چمن میں

رقص

نجم و مہر و مہ کا صبح و شام رقص
کر رہی ہے گردشِ ایّام رقص

بے قراری، نغمۂ رفتار ہے
اضطرابِ نغمہ زا کا نام رقص

رقصِ مطرب، رقصِ ساقی، رقصِ دل
ہے تری محفل میں کیسا عام رقص

موجِ مضطر کو لگے ہیں چار چاند
آب کرتی ہے سیمِ خام رقص

بجلیاں بادل میں ہیں یوں کوندتی
جس طرح رن میں کرے صمصام رقص

تیرے مستوں کا یہی ہے مشغلہ
جیسے کبک اور مور کا ہے کام رقص

جس کو کہتے ہیں ترے گھر کا طواف ہے بزیرِ جامۂ احرام رقص
مقصدِ ہستی نہیں اس کے سوا اس کا ہے آغاز اور انجام رقص

رقصِ بسمل بھی ہے ذوقِ زندگی
مرتے مرتے کر گیا دو گام رقص

آفرینشِ شعر

جیسے ہے صہبا نکلتی تاک سے رنگ و بُو کا خلد تیرہ خاک سے
شاخ سے جیسے نکل آتے ہیں پھول سوئے دنیا حُسن کے سچّے رسُول
چھوٹے بچّوں کا تبسّم بے سبب ذوق و مستی کا ترنم بے سبب
بن میں نکلے کوئی آہو یک بیک آنکھ میں آجائے آنسو یک بیک
چشمہ زیرِ سنگ سے پھوٹے کوئی یا شہاب آسماں ٹوٹے کوئی
آسماں پر ابرِ رحمت کا ورود طائرانِ شاخ کا رقص و سرود
ہم نوا فطرت سے جب ہو سازِ دل شعر بن جاتی ہے ہر آوازِ دل
"خشک تار و خشک چوب و خشک پوست از کجا می آید ایں آوازِ دوست"
چرخ پر ہے جو ستارہ آفریں شعر میں ہے استعارہ آفریں
تھی ازل خاموش ہستی بے زباں روح کی دیرینہ مستی بے زباں
شاعری نے اس کو گویا کر دیا خود بیانی کا ہے جویا کر دیا
گردشِ اختر کا نغمہ بے خروش شعر میں آکر ہوا فردوسِ گوش
شاعری کے نغمہ ہائے دل نشیں ہیں صدائے بالِ جبریلِ امیں

ہم آہنگ ہے اس کے دل سے، فطرت اور انسان کا دل
اس کے سینے میں ہے دھڑکتا گویا سارے جہان کا دل
سب کو ہے یہ لذت دیتا اور سب کا غم کھاتا ہے

کارِ جہاں دشوار بہت ہے جذبہ گر بیدار نہ ہو
خار و خس میں آگ کہاں گر نالہ آتش بار نہ ہو
شاعر اپنے گیت سے ٹھنڈی جانوں کو گرماتا ہے

اوج و بقا کی تدبیریں، اقوامِ جہاں کی تقدیریں
پہلے اس کے خواب کے اندر بنتی ہیں سب تعمیریں
پھر کوئی غیب سے آتا ہے جو ان کو اصل بناتا ہے

سب سے بہتر کام نہ ہو شاعر کا شغلِ بے کاری!
شاید اس کی مستی سے بہتر نہ ہو کوئی ہشیاری!
فطرت کا پیغام نہ ہو جو شاعر ہم کو سناتا ہے

ایک بدسیرت شاعر سے خطاب

فن میں ترے بہار، عمل میں ہے خارزار
فن میں ہے پختہ اور عمل میں ہے خام کار

کیا فن کا طرزِ زیست پہ کوئی اثر نہیں
کیوں اپنی زندگانی پہ تیری نظر نہیں

کیا فکر کا عمل سے کوئی واسطہ نہیں!
حنظل ترا عمل ہے، ترا فکر انگبیں!

اصلاحِ ذات میں بھی جگر خون کرے تو خوب
مانندِ شعر اس کو بھی موزوں کرے تو خوب

اس جستجوئے حُسن میں اپنی بھی کر تلاش
فطرت کو اپنی چھیل کے کوئی صنم تراش

کاوش ہے صبح و شام کہ فن کو سنوار لے
اور اس سے خوب تر ہے کہ من کو سنوار لے

سچّے شاعر کا کام

عطا روحِ انساں کو پرواز کرنا
طبیعت کو فطرت کا ہم راز کرنا

دلِ مضطرب میں سکوں آفرینی
خنک عقل میں کچھ جنوں آفرینی

جہاں کو محبت سے لبریز کرنا
نمِ چشمِ دل کو گہر ریز کرنا

تخیّل سے بے حُسن شے کو سجانا
تصوّر میں ایک اور دنیا بسانا

پیامِ بہاراں فسردہ دلوں کو
ملے زندگی جس سے مُردہ دلوں کو

دلِ انساں کا واقف ہو گہرائیوں سے
کچھ اُونچا ہو دنیا کی دانائیوں سے

عطا اس کو کرنا لطافت نظر کی
کہ نزہت سے بدلے کثافت بشر کی

کوئی خوشنما خواب تعمیر کرنا
پھر الفاظ میں اس کی تعبیر کرنا

غمِ دہر کا جس سے ہو بار ہلکا
نکل جائے جانوں سے دھڑکا اجل کا

کہیں جاں گداز اور دل سوز ہونا کہیں ایک تیرِ جگر دوز ہونا
کہیں مرہم زخمہائے جدائی شکستہ دلوں کے لیے مومیائی
ربابِ دل و جاں کی مضراب بننا شب ظلمتِ غم میں مہتاب بننا
نہیں ہے فقط قافیہ سنج شاعر
دلوں کے معارف کا ہے گنج شاعر

غالب

رشکِ نیّر ہے شررِ آتشِ پنہاں تیرا اور خورشید قیامت گُلِ داماں تیرا
تارِ قانونِ جہاں، رشتۂ جانِ معنی ہو نہیں سکتا ہے شیرازہ پریشاں تیرا
دیکھنا ابرِ گہربار میں بجلی چمکی کہ سرِ چرخ تصوّر ہے خراماں تیرا
نوکِ خامہ ہے تری زخمۂ سازِ عرفاں کہ نوا ریز ہے ہر صفحۂ دیواں تیرا
نظم اُردو کی نہ تھی ذرّۂ خورشید آشام تنگ ساغر میں سماتا نہ تھا طوفاں تیرا
شعرِ پابند کو پرواز سکھائی تو نے لفظِ بے مایہ پہ باقی ہے یہ احساں تیرا
ایک اعجاز ہے معنی میں تگ و دو تیری نقشِ پا ہے صفتِ موجِ خراماں تیرا
سینہ گو چاک رہا تیرا بھی مانندِ سحر داغِ دل تھا صفتِ مہرِ درخشاں تیرا
طبعِ عالی میں تھا کہسار کا تمکین و وقار وضعِ خوددار تھی سرمایہ و ساماں تیرا
پوششِ حرف میں ہے نالۂ عریاں کی جھلک تیرے ہر حرف میں پوشیدہ نیستاں تیرا
سرحدِ عرش سے ہے دُور مکانِ معنی
اس جہاں سے کہیں اُونچا ہے جہانِ معنی

شبِ تاریک میں تو صورتِ مہتاب رہا
پیکرِ بود میں اک دیدۂ بے خواب رہا

تیری بے تابی مجھے باعثِ نظارہ بنی
پسِ آئینۂ دل صورتِ سیماب رہا

جستجو تھی تجھے جس بحر کی، وہ اور ہی تھا
عین قلزم میں بھی تو ماہئ بے آب رہا

جیسے پانی کے تموّج میں ہو سورج کی کرن
تو صفا کیشی میں یوں وقفِ تب و تاب رہا

تھی تری روح کو آزادئ پروازِ ملک
پاؤں میں سلسلۂ عالمِ اسباب رہا

شعرا قلزمِ ذخّار سمجھتے تھے جسے
تیری ہمّت نے جو دیکھا تو وہ پایاب رہا

دیدۂ دہر سمجھتی رہی جس کو خورشید
تیرے آگے صفتِ کرمکِ شب تاب رہا

سطح پر پھرتے ہیں جو صورتِ خاشاک اُن کو
معنئ شعر سدا گوہرِ نایاب رہا

کورِ دل دن کو ہیں یاں رات سمجھنے والے
اور بہت کم ہیں تری بات سمجھنے والے

پیشِ انساں جو رہا جلوۂ منزل ہو کر
تھا فقط سنگِ نشاں تیرے مقابل ہو کر

چشمِ مضطر نے تری خاک پہ ڈالی جو نگہ
تپش آمادہ ہوا، ذرّہ بھی اک دل ہو کر

جیسے ہو گوہرِ تابندہ صدف میں پنہاں
ایسے تو حرف میں پوشیدہ رہا دل ہو کر

شررِ سنگ رہی لیلئ معنی کی جھلک
یعنی رہتی ہے زباں پردۂ محمل ہو کر

سب نے محسوس کیا، ایک نے دیکھا نہ تجھے
تیرا جلوہ رہا بوئے گلِ محفل ہو کر

نہ رُکی بحرِ طبیعت کی تلاطم خیزی
غمِ دنیا رہا اس بحر کا ساحل ہو کر

مَیں کہاں اور مرے فکر کی پرواز کہاں
فن یہ سیکھا ترے انداز پہ مائل ہو کر

مدح کے پھولوں کا گلدستہ بنایا مَیں نے
تیرے گلزار کے گل چینوں میں شامل ہو کر

کشورِ شعر ابد تک ہے ترے زیرِ نگیں
کر وصول اپنی رعیّت سے خراجِ تحسیں

بیادِ حالی

نہ کم پایا تجھے ملّت نے سعدیٔ معظم سے
نکالے گوہرِ نایاب تُو نے فکر کے یم سے
مذاقِ فکرِ فطرت پھر ہوا زندہ ترے دم سے
کہ تُو نکلا خیالی دلبروں کے زُلفِ پُرخم سے
انھیں زندہ کیا آ کر کہ جو مُردوں سے بدتر تھے
تری بانگِ قلم نے مانگ کر "قُم" ابنِ مریم سے
مثالِ ماہ تجھ کو سادگی تھی بہتریں زیور
نہ رُعبِ علم جتلایا کبھی اشعارِ مبہم سے
وفا، افتادگی اور اُلفتِ بے ازل دل میں
اشاروں میں یہ باتیں تو نے سیکھیں چشمِ شبنم سے
غنا ایسی کہ شانِ خسروی اس کو ترستی ہے
جہاں بینی تھی چشمِ دل میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
فلک کے سات پردوں میں سرودِ معرفت ہے جو
نکلتا تھا وہ تیری فطرتِ عالی کے سرگم سے
جہاں کی شش جہت میں ہے مسدّس کا اثر پھیلا
یہ رتبہ اس نے پایا مدحتِ اُمّیِ اکرم سے

اقبالؒ

سینہ تھا ترا مشرق و مغرب کا خزینہ
دل تھا ترا اسرار و معارف کا دفینہ
ہر شعر ترا بامِ ترقی کا ہے زینہ
مانندِ مہِ نو تھا فلک سیر سفینہ

اس ساز کے پردے میں تھی عرفان کی آواز
کیا عرش سے ٹکراتی ہے انسان کی آواز

سچ تلخ تھا لیکن اسے شیریں کیا تُو نے
تلخابۂ غم کو شکر آگیں کیا تُو نے
تعلیم خودی دے کے خدا بیں کیا تو نے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں کیا تُو نے

پر ٹوٹے تھے جن کے انھیں پرواز عطا کی
گونگے تھے جو انساں انھیں آواز عطا کی

دل تیرا مۓ عشق سے لبریز تھا ساقی
اور درد کی لذّت سے طرب خیز تھا ساقی
قطرہ تری مے کا شرر انگیز تھا ساقی
ساغر ترا گل بیز و گہر ریز تھا ساقی

تُف مے پہ جو سنبھلے ہوئے انساں کو گرا لے
وہ مے تھی ترے خم میں جو گرتوں کو سنبھالے

وہ عشق جو انسان کی ہمت کو ابھارے
وہ عشق جو دنیا میں بگڑتے کو سنوارے
جس عشق سے اغیار بھی بن جاتے ہیں پیارے
جس عشق کے اشکوں سے فلک پر بنے تارے

وہ عشق تھا تیرے دل و جاں میں رگ و پے میں
جس طرح نشہ مے میں ہے اور نغمہ ہے نے میں

منزل ہی نہیں جس کی کہیں پر وہ ترا شوق
سیارۂ گردوں کو نہ ہے تحت نہ ہے فوق
آزادئ انساں کا ترے دل میں تھا کیا ذوق
زنجیرِ علائق نہ توہم کا کوئی طوق

وہ بحرِ تفکّر کہ نہیں جس کا کنارا
سیلاب نہیں ڈھونڈتا ساحل کا کنارا

حکمت ہمیں دی شعر کی صہبا میں ڈبو کر — حق پیش کیا سوزِ نہانی میں سمو کر
جس نخل کا دنیا میں گیا بیج تو بو کر — اک روز رہے گا وہ فلک بوس ہی ہو کر

رس عشق کا اس نخل کی رگ رگ میں چلے گا
ہر سمت میں وہ پھیلے گا، پھولے گا، پھلے گا

سمجھایا ہمیں، کیا ہے بُری چیز غلامی — ہے جس سے زبوں، ہو کوئی گمنام کہ نامی
محکوم ہے تو، تو تری فطرت کی ہے خامی — آزادیٔ افکار سے انساں ہے گرامی

آزاد ہی دنیا میں اللہ کا شہ کار
ہر بندۂ آزاد ہے تقدیر کا معمار

ہندی تھے غلامی کے نشے میں سبھی مدہوش — تھے سر پہ رکھے فخر سے اغیار کی پاپوش
حیوانوں کا مقصد تھا فقط خواب و خور و نوش — بے عزّت و بے غیرت و بے ہمت و بے جوش

رسوائی میں جو مست تھے ہشیار ہوئے ہیں
صدیوں سے جو سوتے تھے وہ بیدار ہوئے ہیں

ڈھانچا جو غلط تھا نہ و بالا کیا تُو نے — دنیا کے اندھیرے میں اُجالا کیا تُو نے
اس قوم میں کیا کام نرالا کیا تُو نے — منہ جھوٹ کا اور مکر کا کالا کیا تو نے

تہذیب و سیاست کی طلسمات کو توڑا
سچائی سے ہر جھوٹی کرامات کو توڑا

اقبال، تو پیغامبرِ عشق و عمل ہے — انسان کی ترقی کا یہ قانون اٹل ہے
یہ نغمۂ جاوید ہے یہ سازِ ازل ہے — ہاں انساں کی مشکل کا فقط ایک ہی حل ہے

جاں صرفِ عمل اور ہو دل عشق سے لبریز
اُٹھتا ہے یونہی جادۂ ہستی میں قدم تیز

عاقل تھا مگر عقل کے پیچاک سے آزاد اور حکمتِ افرنگ کے فتراک سے آزاد
دنیا میں تھا دنیا کے غم و باک سے آزاد خاکی تو وہ بے شک تھا مگر خاک سے آزاد

ہے دل کی جگہ دُور کہیں ارض و سما سے
ہوتا ہے جہاں بندہ ہم آغوش خدا سے

ہادی ہے وہ انسان کو جو آگے بڑھا دے تاریکی میں انسان کے ہاتھوں میں دیا دے
جو عقل پہ پردے ہیں پڑے ان کو اٹھا دے صیقل کرے آئینۂ دل اس کو جِلا دے

ہر قلب کو تقدیرِ حقیقی نظر آئے
اور آنکھ کو تصویرِ حقیقی نظر آئے

اقوام ہوں جس بانگ سے بیدار، وہ پیغام انساں ہو مئے عشق سے سرشار، وہ پیغام
ہو بارِ امانت سے گراں بار، وہ پیغام ہر روح حقیقت سے ہو دوچار، وہ پیغام

وہ جوش کہ انسان اُبھر جاتے ہیں جس سے
کھوٹے بھی کھرے بن کے نِکھر جاتے ہیں جس سے

کہتے ہیں سخنور کہ تھا شاہِ سخن اقبال ظاہر میں فقط شعر میں تھا اہلِ فن اقبال
ہے اصل حقیقت یہ کہ تھا بُت شکن اقبال مولا کو وطن کہتا تھا یہ بے وطن اقبال

اس جسم میں تھا روح کی معراج کا طالب
انساں کے لیے دل کے سوا راج کا طالب

عارف کی نظر اپنے وطن تک محدود نہیں کیوں اس کی نظر ہو در و دیوار میں مسدود
گو حُبِّ وطن اس میں تھی اک جذبۂ محمود اقبال نے دھرتی کو بنایا نہیں معبود

خاکی جو نہیں کرتا ہے افلاک کی پُوجا
کس طرح سے کر سکتا ہے وہ خاک کی پُوجا

عارف کی نظرگاہ، وہی اس کا وطن ہے — پورب ہے نہ پچھم ہے نہ اُتّر نہ دکن ہے
ندی کوئی اس میں ہے، نہ پربت ہے نہ بن ہے — نے دیر و حرم کی کوئی تعمیرِ کہن ہے

نے شرق کا گرویدہ، نہ افرنگ کا عاشق
کس طرح سے ہو وہ جمن و گنگ کا عاشق

کم کوئی ہے اس غمکدۂ دھر میں آیا — جس نے وطن اپنا دلِ انساں میں بنایا
انساں کی توقیر کا وہ راگ ہے گایا — موسیقئ جاں بن کے جو جانوں میں سمایا

یہ راگ وہ ہے کون و مکاں سانہ ہے جس کا
روحوں میں نہاں اور عیاں راز ہے جس کا

نہ شیخ سے بیزار برہمن سے بھی بیزار — نہ اس کا پرستار تھا نہ اس کا گرفتار
دولت کا شکار اور نہ سیاست کا گنہگار — افکار سے مستقبلِ اقوام کا معمار

جن ابلہ فریبوں میں ہے مکتی کا اجارہ
تعلیم سے تیری ہے بہت ان کو خسارہ

ہر شعر سے اُٹھتا ہے سدا نعرۂ تکبیر — خوں تیری سیاہی ہے قلم ہے تری شمشیر
اشعار ترے کاتبِ تقدیر کی تحریر — آئینہ بکف جس میں ہے اقوام کی تقدیر

مضراب ترے شعر ہیں انسان کا دل ساز
فطرت ترے نغموں پہ رہی گوش بر آواز

یہ شعر ہے کہتے ہیں جسے جزوِ نبوّت — یہ شعر ہے شاگردئ رحمان کی آیت
یہ شعر بدل دیتا ہے انسان کی حالت — اسی شعر میں ہے عالمِ لاہوت کی دولت

یہ شعر حقیقت میں ہے پروردۂ الہام

نعمت ہے بہت خاص مگر فیض بہت عام

جس کا ہو کلام ایسا کلیم اس کو ہیں کہتے
حکمت سے ہو لبریز حکیم اس کو ہیں کہتے

افکار کی جنت ہے نعیم اس کو ہیں کہتے
اے صاحبِ دل، طبعِ سلیم اس کو ہیں کہتے

انسان ہے اللہ کا معشوق اسی سے

خاکی یہ ہوا اشرفِ مخلوق اسی سے

اقبال کے ہیں شعر سخنداں کی زباں پہ
اقبال کے اقوال ہوئے نقش ہیں جاں پہ

اقبال کے ہیں تیر سیاست کی کماں پہ
تیغوں کو جلا دیتے ہیں اس سنگِ فساں پہ

اقبال نے رنگ اپنا ادیبوں پہ چڑھایا

رنگ اپنی خطابت کا خطیبوں پہ چڑھایا

اب دل میں ہے ہر ایک کے پیدا وہی انداز
اب قوم کی آواز بنی ہے تری آواز

الفاظ میں تیرے ہے کوئی سحر کہ اعجاز
بجتا ہے ہر اک رنگ کی محفل میں ترا ساز

اشعار ترے پیر و جواں سب کو ہیں ازبر

محفل کی ہیں رونق تو کہیں گرمئ منبر

تھے صاحبِ دل رومی و عطار و سنائی
تھی جن کی خودی آئینۂ رازِ خدائی؟

لے عالمِ ارواح کی انسان کو سنائی
کچھ لذتِ وصل اس میں ہے کچھ دردِ جدائی

ایسے ہی فقیروں کا ہم آہنگ تھا اقبال

مردانِ خدا دوست کا ہم رنگ تھا اقبال

انسان کا کیا قحط ہے اس دیرِ کہن میں
اک مردِ حق آتا ہے کبھی ایک قرن میں

سمجھائے انھیں کون جو یاں مست ہیں دھن میں
دولت جو حقیقی ہے وہ انسان کے ہے من میں

اس دولتِ سرمد کا شہنشاہ تھا اقبال
فطرت کی گواہی ہے، حق آگاہ تھا اقبال

کام ایسا جو کرتا ہے وہ مرتا نہیں ہرگز ایسے جو جئے موت سے ڈرتا نہیں ہرگز
دنیا سے گیا، دل سے گزرتا نہیں ہرگز اس صفحہ سے یہ نقش اترتا نہیں ہرگز

جب تک کہ دل افروز یہ پیغام ہے باقی
عالم کے جریدے پہ ترا نام ہے باقی

۶

متفرقات

مذہبی وملّی، طنزیہ ومزاحیہ اور ذاتی نظمیں

"کارسازِ مابہ فکرِ کارِ ما"

خالقِ کونین وہ ربِّ قدیر — جس نے بچپن میں بہائی جوئے شیر
چھوڑ دے کیوں حاجتِ برنا و پیر — کیا نہیں وہ حال کا میرے خبیر

"کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما"

مور سے لے کر ملائک تک کا ربّ — ایک دم غافل نہیں جو روز و شب
ہے سپرد اس کے یہ نظم و نسق سب — بدگمانی ہے یہاں ترکِ ادب

"کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما"

جو خزاں کے بعد لاتا ہے بہار — خیر میں ہے صرف جس کا اختیار
چاہے تو صحرا کو کر دے لالہ زار — کافرِ نعمت ہے جو ہو سوگوار

"کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما"

اس کے آگے کیا ہے میری احتیاج — جو کرے سارے جہاں کا کام کاج
ذرّے ذرّے میں ہے قائم جس کا راج — دکھ دیا جس نے وہی دے گا علاج

"کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما"

۶۱

ڈر نہ طوفاں سے کہیں ساحل بھی ہے ہر رہِ دشوار کی منزل بھی ہے
کشتِ محنت کا کہیں حاصل بھی ہے گردِ صحرا میں کہیں محمل بھی ہے

"کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما"

میری جدّ و جہد کی توقیر کیا میں بھلا کیا اور مری تدبیر کیا
میں کروں تقدیر کی تعمیر کیا اور اپنے حال میں تغییر کیا

"کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما"

نعت

ہر اک ڈوبتے کا سہارا محمدؐ ہے طوفان زدوں کا کنارا محمدؐ
فرشتوں سے اونچا ہمارا محمدؐ خدائے دو عالم کا پیارا محمدؐ

ہے عاشق کا خُلدِ نظارہ محمدؐ
ہمارا محمدؐ ہمارا محمدؐ

ثنا خواں ہیں اس کے زمیں بھی فلک بھی درود اس پہ پڑھتے ہیں جن و ملک بھی
اسی کی مہک ہے گلوں کی مہک بھی اسی کی چمک مہر و مہ کی چمک بھی

وہ ہستی کی آنکھوں کا تارا محمدؐ
ہمارا محمدؐ، ہمارا محمدؐ

شفا بخش وہ دل کی بیماریوں کا وہ دارو تھا انساں کی لاچاریوں کا

وہ شیدا وفا اور رواداریوں کا وہ ہے دھونے والا گنہگاریوں کا
مرض کی شفا دکھ کا چارہ محمدؐ
ہمارا محمدؐ ، ہمارا محمدؐ

محبّت کا پُتلا وہ حکمت کا بانی سُنا حق کا پیغام جس کی زبانی
ہے جب تک کہ باقی یہ دنیائے فانی نہ پیدا کرے گی محمدؐ کا ثانی
نہ اب خود ہی آئے دوبارا محمدؐ
ہمارا محمدؐ ، ہمارا محمدؐ

وہ انسانِ کامل، وہ معراجِ انساں وہ تنویرِ خالق وہ تقدیرِ دوراں
کلامِ محمدؐ ہے پیغامِ یزداں محمدؐ کی سیرت ہے خود عینِ قرآں
ہے قرآں کا ہر اک سپارا محمدؐ
ہمارا محمدؐ ، ہمارا محمدؐ

وہ عاصی کو عصیاں میں کیوں چھوڑ دیتا گنہ سے نہ کیوں اُس کا رُخ موڑ دیتا
وہ طوقِ غلامی نہ کیوں توڑ دیتا محبّت سے کیوں کر نہ دل جوڑ دیتا
وہ دونوں جہانوں کا پیارا محمدؐ
ہمارا محمدؐ ، ہمارا محمدؐ

نوحۂ آزادی

پھونکی گئی سینے میں ترے روحِ الٰہی اے حق کے سپاہی
فطرت نے عطا کی تجھے کونین کی شاہی از ماہ بہ ماہی

اس پر بھی پسند آئی تجھے کیسے غلامی؟
اے مردِ گرامی!

ہیں عرصۂ ہستی میں تو سنگ و شجر آزاد
برق و شرر آزاد
گلشن کی فضاؤں میں ہے مُرغِ سحر آزاد
رکھتا ہے پر آزاد
پھر اشرفِ مخلوق ہی کیوں رشتہ بپا ہے
کس شے کی سزا ہے؟

یہ جاہ کا طالب کہیں بندہ ہے شکم کا
یا دام و درم کا
پھندا کہیں گردن میں پڑا دَیر و حرم کا
وہموں کے ستم کا
زیور ہے سمجھتا اسے پہناؤ جو زنجیر
یہ وہم کا نخچیر

کیوں رکھتا ہے خود ساختہ اصنام سے اُمید
اے بندۂ توحید
خندق میں گرے، کور نے کی کور کی تقلید
ہے فکر نہ تنقید
عنقا ہوئی انسان ہیں آزادئ افکار
ہر کس ہے گرفتار

انسان بنے کس لیے انساں کا پجاری
یا اس کا شکاری
یہ رسمِ ستم دہر میں کب تک رہے جاری
اے خالقِ باری
انسان کرے کس لیے انسان کی تذلیل
کیوں قصۂ ہابیل

مسجودِ ملائک کی ہے تقدیر المناک
گردن میں ہے فتراک

افسوس ہوا گوہرِ تابندہ تہہِ خاک
یہ نیرِّ افلاک
جو عرش کا تارا تھا وہ مفلس کا دیا ہے
مدّھم سی ضیا ہے

آزادی کا گیت

یزداں کی اک تمثال ہے تو — ثروت ہے تو اقبال ہے تو
تو فیض سے مالا مال ہے تو — نُصرت کی فرخ فال ہے تو
ہے دل کی تجھ سے آبادی
اے آزادی اے آزادی

ہے گرچہ فضل و کمال اچھا — سب سے ہے تیرا جمال اچّھا
ہمراہ ترے ہر حال اچھا — ہر دن اچھا، ہر سال اچھا
غم کو بھی بناتی ہے شادی
اے آزادی اے آزادی

اونچا ہے پایۂ جاں تجھ سے، — دل میں ہے تاب و تواں تجھ سے
تو ایماں سے ایماں تجھ سے — ہے جوئے شِیر رواں تجھ سے
تیشہ ہے تیرا فرہادی
اے آزادی، اے آزادی

تو ہے تو مُور سلیماں ہے — ذرّہ خورشیدِ درخشاں ہے
تجھ سے درویش بھی سلطاں ہے — بس تو ہی باغِ رضواں ہے

دھوکا ہے جنّت شدّادی
اے آزادی، اے آزادی

قائم ہے رونقِ دیں تجھ سے انسان بنتا ہے امیں تجھ سے
رشکِ افلاک زمیں تجھ سے کنجشک بنے شاہیں تجھ سے
سکھلائے صید کو صیادی
اے آزادی، اے آزادی

اس تن میں آ اس من میں آ میرے اندازِ سخن میں آ
میرے مظلوم وطن میں آ اے رفتہ بہار چمن میں آ
مرغانِ چمن ہیں فریادی
اے آزادی، اے آزادی

اے خطّۂ کشمیر!

جس قوم کے ہاتھوں میں نہیں رہتی ہے شمشیر اے خطّۂ کشمیر!
کھوتی ہے وہ کونین میں سب عزّت و توقیر اے خطّۂ کشمیر!
پڑھ دہر کے اوراق پہ یہ خون کی تحریر اے خطّۂ کشمیر!
تلوار مجاہد کی ہے قرآن کی تفسیر اے خطّۂ کشمیر!

وادی تری ایمن ہے تو پربت ترے سینا دھرتی کا نگینہ
اُس پر یہ غلامانہ مشقت کا پسینا افگار ہے سینہ

مرنے سے ہے بدتر ترا اس طرح سے جینا یوں زہر کا پینا
فرعون کشی موسئ عمراں کی ہے تدبیر اے خطۂ کشمیر!

یہ لعلِ گراں مایہ، یہ مزدورِ عرق ریز مٹی میں ہیں آمیز
افسوس کہ ہو نکبت و افلاس سے لبریز یہ خطۂ زرخیز
فن کار و حسین صورت و گل کار و گل انگیز اور ذہن رسا تیز
اور آتے نہ آنکھوں کو نظر صورتِ تغییر اے خطۂ کشمیر!

انساں کا ہے فردوس نہ پھولوں سے نہ پھل سے جَل سے نہ کنول سے
نے وادئ گل ریز، نہ آئینۂ ڈل سے نے نہرِ عسیل سے
دُنیا بھی عمل سے ہے تو عقبیٰ بھی عمل سے ہمّت ہی کے بل سے
کر کوشش و تدبیر سے تقدیر کی تعمیر اے خطۂ کشمیر!

سب قوم کے سینے سے اُٹھے گرم فغاں ایک دل ایک زباں ایک
مقصود رکھیں قوم کے سب پیر و جواں ایک ہو سیلِ رواں ایک
لازم ہے کہ ہو قوم عیاں ایک، نہاں ایک سب خورد و کلاں ایک
وابستہ ہو باہم صفتِ حلقۂ زنجیر اے خطۂ کشمیر!

کچھ لعل تری کان کے بیرونِ وطن ہیں جو فخرِ زمن ہیں
بیرونِ چمن بھی ترے کچھ سرو و سمن ہیں اور تابہ دکن ہیں
جن نافوں کی خوشبو سے معطّر ہوئے بَن ہیں بیرونِ ختن ہیں
ماتم میں ترے صورتِ گُل سینہ دریا چیر اے خطۂ کشمیر

———

حکیم سقراط کی بیوی

بیوی خوب جھگڑنے والی روز میاں سے لڑنے والی
کبھی نہ مانے بات میاں کی اپنی بات پہ اڑنے والی
مرغی اور بریانی کھا کر ماش کی طرح اکڑنے والی
سیدھی بات کو الٹی سمجھے پیار سے اور بگڑنے والی
ہاتھ اٹھاتے کیا بیوی پر وہ بھی ڈھول تھی جڑنے والی
شرع و رسم کی ہتھکڑیوں سے
نیک انسان کو جکڑنے والی

ہائن رش ہائنا، جرمن شاعر کی بیوی

بیوی کی کج ادائی بھی منظور ہے مجھے اک دن بھی اس سے مجھ کو گوارا نہیں فراق
میں بیوفائیوں سے بھی آؤں کبھی نہ تنگ اس کی لڑائیوں سے بھی کم ہو نہ اشتیاق
لیکن جو میرا شعر نہ سمجھے، نہ داد دے
از روئے شرعِ شاعری بائن ہوئی طلاق

مرد و زن

ہے مردوں کو دنیا میں سب کچھ معاف
جو چاہیں کریں عقل و دیں کے خلاف

مگر عورتوں پر ہے تعزیر سخت
سرِ مُو نہ عفّت سے ہو انحراف
ہے مردوں کی تقصیر کا پردہ پوش
فراموشی اور خامشی کا خلاف
پشیمانیوں کی جگہ جُرم ہے
ہے فخر و مباہات ولاف و گزاف
انوکھا ہے کیسا تقاضائے رسم!
فقط زن کو تلقین حفظِ عفاف
خلاف اپنے آئیں بناتا وہ کیوں
ہمیشہ اسے ہے مرد قانون باف

عالم اور جاہل

عالم کی تو سَو طرف نظر ہے ۔۔۔ جاہل کی بس اک مقام پر ہے
جاہل ہوتا نہیں ہے مضطر ۔۔۔ ہے اس کی ہر اک روش مقرر
جاہل کا ہے اعتقاد پکّا ۔۔۔ لگتا نہیں اس کو شک سے دھکّا
نادان شکوک سے بری ہے ۔۔۔ برکت سے وہ جہل کی جری ہے
"دشوار ہیں زیست کے مسائل" ۔۔۔ جاہل اس کا نہیں ہے قائل
ہے قابلِ رشک اس کی حالت
اک طرح کا خُلد ہے جہالت

شاہدِ وہمی

کہتا ہوں عرض شاہدِ وہمی کے باب میں
عاشق سے بڑھ کے رہتا ہے جو پیچ و تاب میں

دارو نہیں ہے وہم کا لقمان کے بھی پاس
لکھا ہے بوعلی نے یہ اپنی کتاب میں!

بے اختیار وہم کے گھوڑے پہ ہے سوار
"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

دُھوپ اور چاندنی سے اٹھاتا نہیں وہ لُطف
وہ داغ ڈھونڈتا ہے مہ و آفتاب میں

شامی کباب دیکھ کے ہے مبتلائے خوف
شاید کہ "ڈالڈا" نہ پڑا ہو کباب میں

بے خوف ہو کے پانی بھی پیتا نہیں ہے وہ
اغلب ہے ہوں مرض کے جراثیم آب میں

ہے چھت کو دیکھتا کہ کہیں چھت نہ گر پڑے
اور دفن ہو نہ جائے وہ ملبے کی داب میں

ہر لحظہ اُس کو خوف حسینوں کو دیکھ کر
ممکن ہے کوئی دیو ہو پنہاں نقاب میں

بیداری میں بھی اس کی یہ حالت ہے صبح و شام
لرزاں ہو جیسے کوئی بھیانک سے خواب میں

یہ ساری کیفیت ہے جناب حمیدؔ کی
اور سُوئے ظن نے جس کی ہے مٹی پلید کی

ایک امیر سے خطاب

فطرت نے تیری لعل و گہر سے بھری ہے جیب
دولت عطا ہوئی ہے تجھے اور نظر مجھے

زنجیرِ زر سے پاؤں ہیں جکڑے ہوئے ترے
زنجیر تجھ کو اور دیے بال و پر مجھے

ساحل پہ مردہ وار تجھے لا کے رکھ دیا
طوفاں کی گود میں ہے دیا اس نے گھر مجھے

تجھ کو عطا ہوا ہے اگر نغمۂ نشاط
اس کے کرم نے بخشا ہے سوزِ جگر مجھے

اے بے خبر تجھے نہیں اپنی خبر بھی کچھ
دونوں جہان دیتے ہیں اپنی خبر مجھے

تو ایک گنجِ زر کا محافظ مثالِ مار
ملتے نئے خزانے ہیں شام و سحر مجھے

رازِ درونِ پردہ سے تو آشنا نہیں
یاں پردہ دار کر کے کیا پردہ در مجھے

ساماں ترا مرے لئے انبارِ خار و خس
خرمن تجھے عطا ہوا برق و شرر مجھے

شکوے کی جا نہیں ہے یہ ہے شکر کا مقام
محفل میں تیری گر نہ کیا معتبر مجھے

سر اکبر حیدری

زباں ہلکی سی اک موجِ بیاں ہے
مگر دل ہے کہ بحرِ بے کراں ہے

عروجِ ابنِ آدم کی نہیں حد
زمیں سے آسماں تک نردباں ہے

ہے نیکی سرمدی، ہیں نیک زندہ
یہی رازِ حیاتِ جاوداں ہے

جو اوروں کو بڑا کر دے بڑا ہے
وگرنہ عظمت اک وہم و گماں ہے
نہیں نیکی تو عظمت سیمیا ہے
نہیں ہمت تو دولت رائیگاں ہے،
بڑی مشکل سے ملتی ہے بزرگی
بہا اس چیز کی آرامِ جاں ہے

چلی ہے آج کیا بادِ بہاری
چمن کا ذرّہ ذرّہ شادماں ہے
ہے اب اس شہر پر دہلی کو بھی رشک
دکن اب مرکزِ ہندوستاں ہے
ملا جس کو قلم دانِ وزارت
کمالِ علم و فن کا قدرداں ہے
نظامِ سلطنت میں کوہ کن ہے
مگر شیریں زباں شیریں دہاں ہے
ادھر دل پر ہے داغِ دردِ انساں
ادھر ماتھے پہ سجدوں کا نشاں ہے
تری گفتار ہے لبریزِ حکمت
خموشی مصلحت کی ترجماں ہے
ہے اک وہ خانداں پر ہے جسے فخر
مگر تو ہے کہ فخرِ خانداں ہے
ترا دفتر ہے اس کا دفترِ عدل
اگر شاہِ دکن نوشیرواں ہے
بجا ہے گر کرے تو فخر اس پر
ترا عاشق حکیمِ نکتہ داں ہے

شادی

(یہ اشعار عزیزم حمید غنی کی شادی کے موقع پر لکھے گئے اور برات کی محفل میں پڑھے گئے)

تجرّد کب ہوا شادی سے بہتر
نہ ویرانہ ہے آبادی سے بہتر
یہ سُنت ہے نبی کی، کوئی رہبر
نہیں اسلام کے ہادی سے بہتر

یہ ہے زنجیر کہیے جس کو زیور — یہ پابندی ہے آزادی سے بہتر
ریاضِ زندگی کی باغبانی — ہے گل چینی وصیادی سے بہتر
وفا کا پاس پائندہ محبت — ہے لطف وحظِ میعادی سے بہتر
ہے ہر حالت میں عشقِ روح پرور — ہوس کی سست بنیادی سے بہتر

عروسی سے نہیں بہتر کوئی جشن — نہ رشتہ کوئی دامادی سے بہتر
نہ افضل شاعری سے ہے کوئی شغل — نہ پیشہ کوئی استادی سے بہتر

دری سے جس طرح افضل ہے قالین — ہے مخمل جس طرح کھادی سے بہتر
نہ کوئی کاشمیری سے حسیں تر — نہ خطہ کوئی اس وادی سے بہتر

۷

قطعات و رُباعیات

قطعات

ہوئی کچھ فطرتِ حیواں سے دُوری
یہ دَورِ انساں کا ہے دَورِ عبوری
ہے درد انگیز کیفیت بشر کی
کہ اس حالت میں خاکی ہے نہ نوری

○

شکستہ دل ہے اک جامِ جہاں بیں
ہزاروں نُور لہراتے ہیں اس میں
اسے ترشا ہُوا ہیرا سمجھ لے
کئی پہلو نظر آتے ہیں اس میں

○

تخیّل لالہ زارِ زندگی ہے
تعقّل میں غبارِ زندگی ہے
خرد اِک موج ہے ریگِ رواں کی
تصوّر نوبہارِ زندگی ہے

○

آنکھ رکھنا ہی نہیں ظاہر پرست
ورنہ ہر ظاہر کا اک باطن بھی ہے
ہے بہت مشکل بصیرت کا حصول
غوطہ زن ہو دل میں تو ممکن بھی ہے

○

نہ ہوتی گرم رَو گر جوئے کہسار
زمیں ہموار پاکر تھم ہی جاتی
اُچھلتے کودتے زندہ رہی یہ
جو دَم لیتی یقیناً جم ہی جاتی

○

زندگی میں جب سکت رہتی نہیں
کھلتے ہیں دروازے قیل و قال کے
ہے اپاہج کی تگ و دَو بحث میں
پاؤں لکڑی کے ہیں استدلال کے

○

زمیں دار و زردار و مُلّا و مرشد
یہ ہیں دعوتِ زندگی کے طفیلی
جو محنت کریں تو اُترتا ہے پہنچا
کریں کام تو ہو قبا ان کی میلی
جراثیم ہیں پیکرِ زندگی کے
کہ اقوام میں ہر وَبا ان سے پھیلی

○

کوئی فاتح ہے جنگِ ہستی میں
کوئی کھا کر شکست دَوڑا ہے
آدمی کی یہی ہیں دو قسمیں
کوئی سنداں کوئی ہتھوڑا ہے

○

یہ شاگرد سنتے ہیں اُستاد سے
کہ ہے نفس کو تقویت یاد سے
ہے نسیاں سے بھی آدمی کی بقا
نہ ہو یہ تو انساں ہوں ناشاد سے

○

نفس اور بدن دونوں قوت کے خزانے ہیں
تخریب نہ گر چاہے کر راہِ عمل پیدا
پانی کو عمارت میں ملتا نہیں جب مخرج
بنیاد میں گھستا ہے کرتا ہے خلل پیدا

○

تجھے ہے جانتا سارا زمانہ
زبانِ خلق پر تیرا فسانہ
تو خوش اس پر تجھے سب جانتے ہیں
کچھ اپنے آپ کو تو نے بھی جانا؟

○

تخیّل کی قیاس آرائیاں ہیں ورنہ کیا جانیں
جنم سے پیشتر کیا تھے، جو مر جائیں تو کیا ہوگا
مگر ہے اصلِ دیں اتنا، ہے کافی بس یقیں اتنا
بھلائی کر بھلا ہوگا، بُرائی کر بُرا ہوگا

○

قوت کا حصول اور تفوق کی تگ و دَو
دنیا میں سوا اس کے کوئی بات نہیں ہے
دو ریت کے ذرّے بھی برابر نہ ملیں گے
فطرت میں سبھی کچھ ہے مساوات نہیں ہے

○

ایک نیکی کی بنا توقیرِ نفس
ایک نیکی کی بنا ہے بزدلی
پارسائی پردہ محرومی کا ہے
"عصمت بی بی است از بے چادری"

○

محبت ہے ہر خیر و شر سے پرے
محبت ہے ہر خشک و تر سے پرے
وجوہِ محبّت نہ پوچھ اے حکیم
محبت ہے بحث و نظر سے پرے

○

ہے ضبطِ ماسوا ضبطِ خودی سے
جہاں قابو میں آتا ہے اسی سے
جسے دل پہ نہیں اپنے تصرّف
اُسے دبنا پڑے گا ہر کسی سے

○

جِلائے قلب ہے غم کے اثر سے
فروغِ حُسنِ دل، خونِ جگر سے
یہاں پروردۂ طوفاں ہے ہر حُسن
حقیقت پوچھ لے آبِ گہر سے

○

رُباعیات

انساں نے کیے وضع جو آئین و رسوم
کچھ سینہ بہ سینہ چلے کچھ ہیں مرقوم
تبدیلیٔ حال دیکھ، پہلے تھا جو عدل
آخر اُسی آئیں سے ہے انساں مظلوم

○

ہر دَور میں آئین بدل جاتا ہے
آج آیا جو قانون وہ کل جاتا ہے
ہر عہد میں سکّے تو نئے ڈھلتے ہیں
لیکن ہے کھرا وہی جو چل جاتا ہے

○

کہتے ہیں یہی کہ عہدِ زرّیں گزرا
جمشید گیا، جامِ جہاں بیں گزرا
جو آیا وہ بدتر، جو گیا وہ بہتر
اچھّا تھا وہی سب سے جو آئیں گزرا

○

رخصت ہوا جو عہد تھا جانے والا
انسان اب اور کچھ ہے پانے والا
جس خُلد سے نکلے تھے جنابِ آدم
بہتر ہے اک اُس سے خلد آنے والا

○

تجدید کی تدبیر ہے تیری تقدیر
مقصد ہے ترا جہانِ نو کی تسخیر
فردوس کے خواب ہی نہ دیکھا کر تو
ماحول بدل کے کر کچھ اس کی تعمیر

○

دنیا کو حقیر کہہ رہے ہیں مجبور
دیتے ہیں بہت درسِ قناعت معذور
تھی شیخ کی دسترس سے باہر دُنیا
کہتی ہے یہ لومڑی "ہیں کھٹّے انگور"

○

کانٹے ہیں چمن میں ہر گُلِ تر کے قریب رہتے ہیں یہاں خزف بھی گوہر کے قریب
نیکی سے خبردار رہے بندۂ نیک ہے خیر کی افراط بہت شر کے قریب

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ممتاز اختر مرزا

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا شمار مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے پاکستان کی معروف ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ ہرچند ان کا اصل میدان فلسفہ تھا، جس میں انھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے لیکن ان کے علمی اور ادبی کارنامے زندگی کے گوناگوں شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ سیاست، فلسفہ، مذہب، سائنس، شاعری --- غرضیکہ کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر ان کے بلند پایہ خیالات ہم تک نہ پہنچے ہوں۔

اس کتاب میں محترمہ ممتاز مرزا نے خلیفہ صاحب کے فکروفن کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ مطبوعہ مواد کے ساتھ ساتھ خلیفہ صاحب کے بارے میں خاندانی روایات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ حقائق کی چھان بین اور واقعات میں تاریخی تطابق پیدا کرنے کے لیے خلیفہ صاحب کے قریبی دوستوں، معروف ہم عصروں اور عزیزو اقارب سے انٹرویو لے کر مواد فراہم کیا گیا ہے۔

خلیفہ صاحب کی زندگی، فن اور علمی ماحول پر یہ کتاب ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔

قیمت : ۵۰/۱۰ روپے

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اسلام کا نظریۂ حیات

یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی شہرہ آفاق انگریزی تصنیف ''اسلامک آئیڈیالوجی'' کا ترجمہ ہے جس میں اسلام کے مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کا دوسرے نظریات سے اور اسلامی نظریۂ حیات کا دوسرے نظام ہائے فکر سے مقابلہ کر کے ایک طرف مغربی دنیا کو دعوت فکر دی گئی ہے اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو جمود و بے حسی اور تقلید پرستی کے طلسم کو توڑنے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔

قیمت 10.50 روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ،

کلب روڈ - لاہور

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

حکمتِ رومی

جلال الدین رومی کے افکار و نظریات ایسے دائمی حقائق پر مبنی ہیں جن کی اہمیت اور قدر و قیمت میں گردشِ زمانہ کوئی کمی نہ کر سکی اور ان کی مثنوی ہے جس کو "قرآن در زبان پہلوی" کہا گیا ہے علامہ اقبال ویسے ہی متاثر ہوئے جیسے کہ مولانا جامی - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی یہ تصنیف رومی کے افکار و نظریات کی حکیمانہ تشریح ہے جس میں ماہیتِ نفسِ انسانی ، عقل و عشق ، وحی و الہام ، وحدتِ وجود ، احترام آدم ، صورت و معنی ، عالم اسباب اور جبر و قدر کے بارے میں رومی کے خیالات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے -

صفحات 258 قیمت 6.50 روپے

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

تشبیہاتِ رومی

مولانا جلال الدین رومی تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ ہیں اور ہر قسم کے اخلاقی اور روحانی مسائل کو سلجھانے اور ہر باریک نکتے کی وضاحت کرنے کے لیے ایسی دلنشیں تشبیہ دیتے ہیں جو وجد آور بھی ہوتی ہے اور یقین آفریں بھی - رومیات کے نامور عالم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ان تشبیہات کی بڑی دلکش انداز میں تشریح کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ رومی نے دلکش و دل پذیر تشبیہوں سے کام لے کر حکمت و معرفت اور حیات و کائنات کے اسرار کس آسانی سے حل کر دیے ہیں -

صفحات 612 قیمت 8.00 روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

کلب روڈ - لاہور